عصمت چغتائی
دل کی دنیا
ورائٹی بک ہاؤس
کینٹ بازار ایبٹ آباد

کیسا عجیب اور پراسرار وقت ہوتا ہے، جب ایک دم آنکھ کھلے اور یہ پتہ نہ چلے کہ چھت پٹا ہو رہا ہے یا پو پھٹ رہی ہے! اپنا سر کدھر ہے اور پیر کدھر! کہاں سوئے تھے کہاں جاگے! اس وقت سر پیر کی سمت معلوم کرنا کتنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر فوراً نہ معلوم ہوا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جائیں گے۔

بچپن میں تو رونا آنے لگتا تھا۔ پھر کسی نامعلوم سمت سے ایک وزنی دھموکا پڑتا اور ہمیں فوراً اپنے وجود کا اتہ پتہ مل جاتا۔ یکلخت ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے اور ہم اپنے وجود کا مزید ثبوت دینے کے لئے فوراً مرغیوں کو کھدیڑنے لگتے یا آپس میں کتے کے پلوں کی طرح ایک دوسرے سے گتھ جاتے۔ تب اماں ہمیں دفعان ہونے کا حکم دیتیں، ہم ہنسی خوشی دفعان ہو جاتے اور باغ میں آدھ کھلی کلیاں چن کر جھولیاں بھرنے لگتے۔

یہاں تک کہ اندھیرا ہو جاتا۔ علی بخش لال ٹینوں کا گچھا صدر دروازے کے ٹاٹ کے پیچھے سے اندر بڑھا دیتے، بتیاں اُکسا کر لالٹینیں گھر کے کونے میں پہنچا دی جاتیں اندھیروں

میں کھوئے ہوئے در و دیوار پھر لوٹ آتے۔

پھر چوکیدار سیڑھی پر چڑھ کر صدر دروازے کی چوکور بتی جلا دیتا۔ پورے ایک دم جھجک کر تاریکی میں کھسک جاتے اور ہمارے کرتوں کی جھولیوں میں پھول کھلنے شروع ہو جاتے تب بیکار ہی ڈرنے لگنے لگتا۔ ایک تو زرد رو گرگٹ گال پھلائے کچ کچ منہ میں زہر گھولتا پھر سرخ انگارا ہو کر چھلانگیں بھرتا املی کے درخت پر دوڑ جاتا اور ہمارے پیر موم بتیوں کی طرح پگھلنے لگتے ــــ اسی سمے دور ترائی میں وہ پراسرار آواز لہراتی سنسناتی پھیل جاتی۔

"کانہیا توری مرلی بیرن بھئی"

"ہم بگ ٹٹ بھاگ کھڑے ہوتے اور صدر دروازے کا پردہ اُلجھتے گھر میں غوطہ مار جاتے۔ پھولوں سے بھری جھولیاں بوڑھیوں کی جائے نمازوں پر الٹ کر ہم اُن کے آنچلوں میں پناہ گزیں ہو جاتے۔

"دادی اماں جلدی سے آیتہ الکرسی چھو کرو"

جب دادی اماں کی احمد حسین دلدار حسین کے قوام میں بسی ہوئی چھو ہمارے چہروں پر پڑتی تب کہیں جا کے جان میں جان آتی۔

"کنہیاں توری ی ی..... مرلی..... بیرن بھئی" آواز دور اور دور ہوتی جاتی پھر گم ہو جاتی اِصرف ہوا کی سائیں سائیں رہ جاتی۔

ہمارے ابا نئے نئے بدلی ہو کر بہرائچ آئے تھے۔ ہماری دو منزلہ وسیع کوٹھی کے سامنے ہی سید سالار مسعود غازی کی درگاہ تھی۔ پہلو میں بائیں باغ تھا۔ جہاں ہماری جاگتی ہوئی زندگی کا بیشتر حصہ گزرتا تھا۔ کوٹھریوں کی قطار کے بعد ایک بہت بڑی سی باولی تھی جس پہ پُرچلا کرتا تھا پچھواڑے بھٹوں کے کھیت تھے۔ دوسری طرف ایک سفید مسجد تھی اور دور تک ہار سنگھار، بیلا چمبیلی اور موگرے کے پیڑ چلے گئے تھے۔ مسجد سے ذرا ہٹ کے قبرستان تھا۔ اور نہر کے کنارے خربوزوں کے کھیتوں کے بعد مرگھٹ تھا۔ ہمیں ان دونوں مقامات سے بحید ڈر لگتا تھا۔ یہ پُراسرار

آواز اسی طرف سے آتی تھی، اور اس طرف سے آنے والی ہر شے خطرناک لگتی تھی۔
جب شرارت کرتے، اودھم مچاتے، تو اسی آواز سے ڈرایا جاتا۔ "ڈائن ہے۔ کچا چبا جائے گی۔ بد روح ہے۔ اکیلے دُکیلے پکڑ لیا تو ٹونا کردے گی۔ سنا ہے گھاگرا ندی میں کوئی بارات ڈوب گئی تھی، دلہن بھوتنی بن کر ترائی میں بھٹک رہی ہے۔
اس آواز میں ایک اور خاصیت تھی کہ جب بھی یہ آواز سنائی دیتی تو قدسیہ خالہ پر دل کا دورہ پڑ جاتا۔ دانتی بھینچ کر منہ سے پھین نکلنے لگتا اور گھر ماتم کدہ بن جاتا۔
"یا قوی قادر ــــ قدسیہ کے دولہا کو کر دو حاضر" نانی بیوی جھوم جھوم کر گڑگڑاتیں۔ مگر قوی قادر تو ایسے کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے کہ کسی کی سنتے ہی نہ تھے، قدسیہ خالہ کے دولہا کو حاضر کرنے کے بارے میں کچھ غور فرما رہے تھے۔ اُن کی شادی کو دس برس ہونے کو آئے تھے۔ شادی کے بعد دولہا کو فوراً ہی نانا جان نے ولایت بھیج دیا تھا کہ یہی شرط شادی تھی۔

وہاں سے وہ اس زمانے کے دستور کے مطابق ایک عدد میم لٹکا لائے اور مین پوری میں پریکٹس کرتے تھے۔ اسی لئے قدسیہ خالہ وظیفے پڑھتیں، چلّے کھینچتیں اور جب وہ ناکام ثابت ہوتے تو دانتی بھینچ کے دورے ڈال لیتیں۔ اور غریب کیا کر سکتی تھیں انہوں نے "سرتاج من سلامت"، کے نام درجنوں خط بھیجے۔
"مجھے میم صاحب کی آیا سمجھ کر ہی ایک کونے میں ڈال لیجئے۔ آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔ جھوٹن کھاؤں گی۔ اترن پہنوں گی اور منہ سے اُف کر جاؤں تو جو چور کی سزا سو میری۔ آپ مالک ہیں میں آپ کی لونڈی۔ میرے لئے اس سے بڑھ کے کیا خوش نصیبی ہوگی کہ آپ کے قدموں میں دم نکلے" وغیرہ وغیرہ، مگر سرتاج نے جواب دینا بھی حماقت سمجھا۔
عام طور پر قدسیہ خالہ کا لوگوں سے یہی کہہ کر تعارف کرایا جاتا تھا۔ کہ "بھئی یہ ہیں

قدسیہ، جن کے میاں نے میم ڈال لی ہے۔ لوگ خاصے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اس وقت قدسیہ خالہ بھی اپنی نامرادی بھول کر فخر کرنے لگتی تھیں۔ اُن کی سوت حاکموں کی بیٹی تھی۔ کیا عجب بادشاہ سلامت سے دور دراز کا ناطہ بھی ہو۔ ہر کوئی میم تھوڑی ڈال سکتا ہے۔ ایک طرح سے میاں نے میم سوتن لاکر اُن کی عزت افزائی کی تھی، کوئی دھوبن، چمارن بھی ڈال سکتے تھے۔

قدسیہ خالہ کی پندرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ چھٹے مہینے میاں ولایت کو سدھار گئے۔ دو سال تک تو دیوانگی سے عشق چلتا رہا۔ ہر وقت سر اوندھائے یا میاں کو خط لکھا کرتیں یا آیا ہوا خط پڑھا کرتیں۔ پھر خط پھیکے پڑنے شروع ہوئے، پھر ٹھنڈے پڑ گئے یہ خط لکھ لکھ کے دیوانی ہو گئیں، وہاں سے جواب ندارد! پھر بُری بُری سنادنیاں آنے لگیں پہلی جنگِ عظیم کے بعد میموں کا بھاؤ گر گیا تھا اس لئے جو ولایت جاتا بہتی گنگا سے مچھلی مار لاتا، مگر قدسیہ خالہ کے میاں نرالے تھے اور بھی لوگ میمیں لا رہے تھے۔ چھٹے چھ ماہے ہندوستانی بیوی کو صورت تو دکھا جاتے تھے۔ انہوں نے تو ایسی چپ سادھی کہ الٹ کے خبر ہی نہ لی۔

جب ہی تو عُرس پر قوالی ہوتی تو قدسیہ خالہ کو دورہ پڑ جاتا۔ آس پاس کہیں شادی ہوتی اُن کی دانتی بھنچ جاتی، کوئی دور کہیں رات کے سناٹے میں برہا گاتا اُن کے منہ میں پھین آجاتے۔ خاص طور پہ یہ پُراسرار آواز جب بھی انھیں سنائی دیتی بیکل ہو کر ٹہلنے لگتیں، انگلیاں چٹخاتیں، آنچل مروڑتیں اور دورہ ڈال لیتیں۔

ہم کلیاں چن رہے تھے، جھُولیاں چھلک رہی تھیں، مگر ہمیں صدر دروازے کے چوکور قندیل کے روشن ہونے کا انتظار تھا کہ یکایک وہ آواز بالکل ہماری پشت پہ لہرائی رونگٹے کھڑے ہو گئے ہم نے چونک کر دیکھا، وہ مسجد کے پچھواڑے پرانے قبرستان میں ٹوٹے پھوٹے قبرستان کے درمیان آندھی میں گرے ہوئے ایک برگد کے درخت کے تنے پہ کچھ

روٹھی سی بیٹھی تھی۔ وہ گاتے گاتے رُک گئی۔ ہمارے پیر بھوسا بھری بوریوں کی طرح دھنسنے لگے۔

"چھوڑو ہمرا آنچل!" وہ اپنی پشت کی طرف مڑ کر کسی کو ڈانٹ رہی تھی۔
ہم گرتے پڑتے بسورتے بھاگے۔
اس کا آنچل کوئی نہیں پکڑے تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔
وہ ایک دم تنک کر کھڑی ہو گئی اور آنچل جھٹک کر ہنستی ہوئی تیز تیز بھاگی
جیسے کوئی شریر اُسے پکڑنے دوڑ رہا ہو۔ تیز تیز چلتی وہ پیڑوں میں گم ہو گئی۔
تب ہماری گھگی بندھی اور پیروں کا بھوسہ بکھرنے لگا۔
"میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے۔" دور اُس کی آواز نے لہرا لیا۔ اور
ہم غڑاپ سے پردہ پار۔
"تم سیاں کالے، ہم گورے۔"
"آئینہ میں دیکھیں گے دونوں جنے" اُس کی آواز چڑیا کی طرح پھڑکنے
لگی۔ اور ہماری پیٹھ پر موتی پرونے کی سوئیاں سی چلنے لگیں۔
تم سیاں موٹے ہم دبلے"
"کلنٹے میں تلیں گے، دونوں جنے۔"
کیسے اتفاق کی بات تھی، قدسیہ خالہ کے دولہا کالے بھی تھے، اور موٹے
بھی، مگر میرٹھ میں ملنے کے کوئی آثار نہ تھے! پھر وہ دورہ نہ ڈالیں تو کیا کرتیں۔
نانی بیگم کو تو فرصت نہ تھی۔ دادی اماں ابھی تسبیح پر بُدبُدا رہی تھیں۔ اُن کی
بہن دادی بی نے "چھو" کی تب بھی خوف دور نہ ہوا۔ اُف کتنی دادیاں، نانیاں،
خالائیں، پھوپیاں، بھری پڑی تھیں، مگر کوڑی کام کی نہیں "چھو" تک میں دم نہیں۔
"اُن کے منھ نہ لگا کرو بٹیا،" مجاور نے جب ہم جمعرات کو درگاہ پر پھول

چمڑے سلنے جلتے بھنتے تو کہا تھا۔

"بڑی کھترناک عورت ہے۔"

"کیوں ؟" بڑی منحوس ہے۔ مائی باپ کھسم سب کا کھائے گی۔"

"کھا گئی۔" ہم سمجھے سچ مچ نمک مرچ چھڑک کر کھا گئی۔

"اکیلے ماں باپ کو تو تمہرا جیو نکال کے کھائے جیہے!"

کمبخت نے اور ڈرایا۔

"کیا ڈائن ہے۔"

"اور کا ؟"

"لاحول ولا قوۃ ـــ کیا بکواس ہے۔ نہیں بچو بیچاری پاگل ہے۔" شاہ صاحب نے مجاور کو ڈانٹا۔

"پاگل ؟" شاہ صاحب کی بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ سارا رومان ختم ہو گیا صرف پاگل ہے اور وہ بھی مزے دار پاگل نہیں۔ نہ اس میں سے بدبو آتی ہے نہ کپڑے پھاڑتی ہے۔ نہ اینٹے مارتی ہے۔ بس۔ بس جب دیکھو گا رہی ہے۔

"سیاں توری گودی پھول گیندا بن جاؤں گی۔

بلما توری گودی"

آواز بڑی میٹھی تھی جبھی تو قدسیہ خالہ تڑپا کرتی تھیں۔

"اچھی بی اماں نگوڑی کو بلوا لیجئے نا، ذری گانا سنیں گے۔"

"نا بیٹی موئی پاگل کو کیا بلاؤ گی۔ اچھے بھلے گھر کی لڑکی، پردہ وردہ کو آگ لگا منڈو منڈ ڈولتی پھرے ہے۔ سنا ہے اُس پر سایہ ہے۔ ساری بارات گھاگرا ندی میں ڈوب گئی۔ یہ ترتی رہی تین دن تک۔ جانو کسی نے تلے ہتھیلی لگا دی ہو۔"

"پر دکھیا گاتی اچھا ہے۔" قدسیہ خالہ کو گانا سننے کا جنون تھا۔ جب شبیر ماموں

نعتیں پڑھتے تو اُن کی آنکھوں سے ندی نالے بہہ نکلتے۔

"تم پہ قربان، میری جان، رسولِ عربی" وہ گاتے، اور قدسیہ خالہ آنچل میں ناک دبائے سسکیاں بھر بھر کے جھومتیں، سب تنے بیٹھے رہتے اور اس دورے کے پڑنے کا انتظار کرتے جو شبیر ماموں کے آنے اور نعتیں پڑھنے پر ضرور پڑ جاتا۔ خالہ کے ہاتھ ٹیڑھے ہو جاتے، آنکھیں نٹھور لیتیں، اور منھ سے جھاگ ابلنے لگتے۔ نانی دادی دوڑ کر اُن پر آیتیں پڑھ کر دم کرتیں۔

شبیر ماموں دور چوکی پر بیٹھے اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپایا کرتے اور جب تک انھیں چین نہ آجاتا بے قرار صدر دروازہ کے پاس ٹہلتے جاتے۔

شبیر ماموں قدسیہ خالہ کے رشتہ میں دیور ہوتے تھے۔ غریب والدین کے نہایت مسکین پھُس پھُسے اور مرگھلّے سے اکلوتے بیٹے تھے اور بہن بھائی پیدا نہ ہو کر زیادہ مزے میں رہے، ورنہ ہمارے اُن ہی جیسے پھُس پھُسے اور مرگھلّے بہت سے ماموں ہوتے۔ بڑے ہی دُبلے پتلے اور قدسیہ خالہ سے کوئی گز بھر او نچے تھے۔ بالکل اونٹ کی طرح کبھّ نکال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلتے تھے۔

"شبیر بھائی کچھ سنائیے۔" قدسیہ خالہ اُن کے آنے پر غمناک آواز میں فرمائش کرتیں، "سنائیے نا ذری جی ٹھہرے گا۔"

"کیا سناؤں، آج گلا خراب ہے۔" وہ ہمیشہ ایک ہی عذر پیش کرتے۔ پھر ذرا گلا صاف کرتے، آنکھیں میچیاتے، نتھنے پھُلاتے، دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے درمیان لٹکا لیتے اور ـــــ

"سُن اے بادِ صبا تو جا ـــــ سُنِ طیبہ اگر گزرے
تو جا کر تھامنا ـــــ بابِ حریم پاک کے پردے"

بڑی صاف ستھری ہوئی نرم آواز میں وہ گاتے۔ اس وقت ان پر بہت ترس آتا۔

بادِ صبا کمبخت بھی کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی تھی۔ نہ اُن کی سنتی تھی نہ جانبِ طیب جاتی تھی۔

سب کو معلوم تھا کہ شبیر ماموں کو قدسیہ خالہ سے اُنس تھا۔ مگر کیا مرگھ اونگھتا ہوا عشق تھا گھر کی اور سیانی لڑکیوں لڑکوں کا بھی عشق تھا۔ کیا دندناتا ناقندیں ما جب دیکھو دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ کونوں کھتروں میں دبوچا جا رہا ہے۔ اکیلا پایا اور بھنبھوڑ ڈالا۔ تاش کے بہانے چھین جھپٹ، پچیسی کی کوڑیاں چھینی جا رہی ہیں۔ گھر کے بڑے بوڑھے ڈانٹ رہے ہیں۔ جہنم میں تھوک رہے ہیں، مگر چکنے گھڑے کھی کھی ہنسے جا رہے ہیں۔

مگر شبیر ماموں تو پاس لگ کے بھی نہ بیٹھے، کبھی چھوٹی انگلی بھی نہ چھوائی۔ د شجرِ ممنوعہ جو تھیں کسی اور کی امانت جو انھیں رکھ کے بھول چکا تھا۔ پچیسواں ختم ہو کر چھبیسواں سال لگا تھا کہ مانگ میں پکے بال چمکنے لگے۔ سب ہی چاہتے تھے جلدی سے بوڑھی ہو جائیں کہ قصّہ ختم ہو۔

"ناسجائی ہم او پگلیا کا ناہیں بلائے جاویں گے۔" دانہ دلنے والی سڑاندی پٹھانی بُوا سے قدسیہ خالہ نے خوشامد کی تو ٹکا سا جواب دیا۔ "کھسم کھائی ڈھیلا مارت ہے۔"

"بھئی کمال ہے اسے مردوئے چھیڑتے نہیں۔ کوئی اور سری کی ہوتی تو تکّا بوٹی ہو جاتی۔ نامُراد بنی ٹھنی سولہ سنگار کیے رات برات جنگلوں میں گھومتی ہے، ڈر نہیں لگتا؟" چچی بی نے پوچھا۔

"ارے اُو کا کاہے کا ڈر؟ ہے مجال کوئی، او کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے۔" پٹھانی بولیں۔

"کیوں، کیا شیرنی ہے۔ پھاڑ کھائے گی؟ اکیلی دُکیلی گھومتی ہے۔"

"اکیلی ناہیں گھومت ہے اُو کے میاں جو سنگ ہوت ہیں۔"

"میاں کون ؟"

"بالے میاں ــ!"

"لو اور سنو! اے چل ہٹ دیوانی۔"

"چل ہٹ کا ؟ کسم سے میاں کی پیاری ہے اپنے گاجی میاں کی بندنی ہے۔"

پٹھانی بوا نے تفصیل سے بتایا کہ وہ غازی میاں کی محبوبہ ہے۔ حالانکہ غازی میاں کو جامِ شہادت پیئے چار سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ عشق صدیوں کے ہیر پھیر کا قائل نہیں۔

غازی میاں کے مزار پر ہر سال عُرس ہوتا۔ دُور دُور سے قوال اور گویئے آتے ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ، بوڑھے جوان، بچے، عورت، مرد زیارت کے لیئے حاضر ہوتے، منتیں مانی جاتیں، مُرادیں پوری ہوتیں۔ ہر جمعرات کو شہر کی، اور آس پاس کے قصبوں کی طوائفیں نذرانہ لے کر آتیں۔ میاں کی شان میں غزلیں، ٹھمریاں، دادرے گاتیں، جب کسی نوچی کی نتھنی اُتاری جاتی تو پہلے وہ میاں کے مزار پہ حاضر ہو کر مجرا گزارتی مئی جون کی شعلہ بار گرمیوں میں میلہ لگتا۔ عقیدتمند مہینوں پہلے سے آکر پڑاو ڈال دیتے عین میلہ کے دنوں میں اتنی خلقت جمع ہوتی کہ آس پاس کئی میل تک تِل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ درگاہ کے بلند دروازہ کے آگے دل بادل تانا جاتا۔ زائرین آتے پھولوں کا دونا مٹھائی اور پیسے شامیانے پر اچھال دیتے۔ مختلف گاؤں اور قصبوں سے جھنڈے آتے۔ ساٹھ ساٹھ فٹ کے بانسوں کے سرے پر سیاہ یا سفید بالوں کا گچھا آویزاں ہوتا، اس کے نیچے پچاس کا پھریرا لہراتا ہوتا۔ جس کی منت پوری ہوتی، وہ مزار پر جھنڈا چڑھاتا۔ ڈھول تاشے بجاتے کودتے، اچھلتے درگاہ کے سامنے پہنچ کر ایک حلقہ بنا لیتے، بیچ میں ایک مضبوط سا آدمی جھنڈا لئے ہوتا۔ سہارے کے لیئے اس کے سرے پر رسیاں باندھ کر چار آدمی تانے رہتے کہ جھنڈا سرنگوں نہ ہو جائے پھر وہ پہلوان اس جھنڈے کو اونچا اٹھا کر رقص کرتا۔ عجیب

عجیب کرتب دکھاتا۔ کبھی جھنڈا ماتھے پہ سادھ کر تھرکتا، کبھی دانتوں پر رکھ کے جھومتا جب سب پسینہ پسینہ ہو جاتے یا شائد وقت ختم ہو جاتا، کیونکہ دوسرے جھنڈوں کے جلوس منتظر کھڑے ہوتے کہ ایک جھنڈے کا ناچ ختم ہو تو دوسرے کو موقع ملے۔ پھر تھکے ہارے جھنڈے کو جہاز کے مستول کی طرح پھریرے میں لپیٹ کر کندھوں پر رکھ کر بلند دروازہ سے اندر لے جایا جاتا۔ اور دوسرے جھنڈے کا ناچ شروع ہو جاتا۔ میلے کے خاتمہ پہ جھنڈے نیلام کر دیئے جاتے تھے۔ ہماری اماں ہر سال یہ جھنڈے نیلام خرید کر انھیں چوکیوں پہ جانموں کی طرح استعمال کیا کرتی تھیں۔ یہ جانمازیں سوزن کاری کا لاجواب نمونہ ہوا کرتی تھیں۔ کھدر پر مختلف رنگوں کے کپڑوں کی کترنوں سے ہاتھی گھوڑے بنے ہوتے تھے۔ کہیں فوجیں نیزے اٹھائے جا رہی ہیں۔ کہیں اونٹ سواروں کی قطاریں، کہیں بھیڑ بکریوں اور گایوں کی ریوڑ، کہیں راز و نیاز میں مصروف عورت مرد ہم گھنٹوں چوکیوں پہ لوٹ لوٹ کر نظارے کرتے مگر جی نہ بھرتا۔

جھنڈوں کے علاوہ جس کی کبھی منت پوری ہو جاتی وہ خوش نصیب سونے، چاندی کے تیلے، میز کرسی، مسہریاں اور برتن حسب وعدہ چڑھاتا۔

پھر غازی میاں کی شادی کی رسمیں شروع ہو جاتیں۔ بلند دروازہ پر نوبت رکھی جاتی۔ بڑی ہی اکتا دینے والی تال میں صبح تڑکے سے بجنا شروع ہو جاتی اور رات گئے تک بجا کرتی۔ گروہ کے گروہ آکر نوبت بجانے والوں کو گھیر لیتے۔ پھر دو چار منچلے کانوں پہ ہاتھ رکھ کے بر ہا گانے لگتے۔ ایک گروہ شل ہو جاتا تو دوسرے اس کی جگہ آ جاتے۔ آسیب زدہ عورتیں میاں کی چوکھٹ پہ بھوت اتروانے آتیں۔ بال کھول کر سر دھنتیں جب منتر پڑھنے والے دھونی دیتے تو چیخیں مار کر بے ہوش ہو جاتیں پھر ہوش میں آکر جھومنے لگتیں۔ زبردست قسم کا بھوت ہوتا تو کئی کئی دن ہو جانے ڈٹا رہتا ہے۔ لال ہرے ڈنڈوں سے بھوت کی خبر لی جاتی۔ تب بڑی مشکل سے جان چھوڑتا۔ پھر صحت

پانے والی درگاہ پر چڑھاوا چڑھاتی۔ اور خوشی خوشی رخصت ہو جاتی۔

پانچ تاریخ کو پنکھا اٹھتا۔ پھر سات کو صندل اور نو کو مہندی اُسی شب کو غازی میاں کا کرتا جس پر مکمل کلام مجید لکھا ہوا تھا۔ زیارت کے لئے کھولا جاتا۔ خلقت ٹوٹ پڑتی۔

گیارہ تاریخ کو بارات چڑھتی۔

رادھا بائی عرف زہرہ بی بی ردولی کی بال ودھوا میاں کو دل دے بیٹھی۔ غازی میاں نے اُسے خواب میں بشارت دی اور اُسے سوئیکار کر لیا۔ وہ مزار پر دھونی رما کر بیٹھ گئی۔ روز اپنے آنسوؤں سے مزار کو اشنان کراتی اور بالوں سے فرش جھاڑتی۔ اس کا باپ تیلی تھا وہ اُسے زبردستی گھسیٹ لایا۔ مگر رادھا اپنی ضد پر اڑ گئی۔

رادھا نام کی سب ہی لڑکیاں بڑی ضدی ہوتی ہیں۔ بانگِ دہل وہ اپنے عشق کا اعلان کرتی ہیں۔ ساری ذلتیں اور بدنامیاں ہنس کے جھیلتی ہیں۔ تن من دھن کی بازی لگا دیتی ہیں اور پانسہ اُن کے ہی حق میں پڑتا ہے۔ مخالف ہوائیں اُن کے جذبۂ عشق کے آگے سر جھکا دیتی ہیں۔ پھر لوگ اُن کے اس جذبہ کی پوجا کرنے ہیں۔ اُن کی شان میں گیت گاتے ہیں اور انھیں دیوی کا استھان بخشتے ہیں۔

غازی میاں کی رادھا کو بھی انگاروں پر چلنا پڑا اور کانٹوں میں گھسیٹنا پڑا۔ اُس کی ماں نے اُسے چار چوٹ کی مار دی۔ باپ نے بھیگی رسّی سے اُس کی کھال ادھیڑ دی اور بھینس کے کھونٹے سے باندھ دیا۔ اور سارے گاؤں نے اس کے منہ پر تھوکا۔

آدھی رات کو جب بھوکی پیاسی رادھا زخموں سے چور گوبر میں لت پت پڑی دم توڑ رہی تھی تو غازی میاں نے اپنے آنسوؤں سے اس کے زخم دھوئے اُسے اپنی مقدس چھاتی سے لگا لیا اور اپنے خونِ جگر میں شہادت کی انگلی ڈبو کر اُس کی مانگ بھر دی۔

جب متوالی میرا نے اپنے گردھر گوپال سے پیار کیا تو دنیا نے اس کی زندگی

میں ناگ چھوڑ دیئے۔

اور زہر کا پیالہ دیا۔

پھر کرشن مراری کی مرلی جاگ اٹھی۔

اور ناگ پھولوں کی مالا بن گیا۔

زہر کا پیالہ امرت سے چھلک پڑا۔

صبح سویرے ردولی والوں کی آنکھ کھلی تو مندروں میں گھنٹے بج رہے تھے۔ اور مسجد کے برج سے اذان گونج رہی تھی۔ رادھا چندن میں بسی شاہانہ جوڑا پہنے پھولوں کی سیج پر ابدی نیند سو رہی تھی جسم پر ایک خراش کا نشان بھی نہ تھا کندن کی طرح شریر جگمگا رہا تھا مانگ میں سیندور مسکرا رہا تھا۔

ردولی والوں کی جان نکل گئی۔ پنچایت بیٹھی اور فیصلہ ہوا کہ بیٹی پرائے گھر کی ہو چکی۔ اب میکہ میں اُس کا کیا کام۔ لہذا دلہن کو سسرال پہنچا دیا گیا۔

ہندو اُسے رادھا کہتے ہیں اور مسلمان زہرہ بی بی۔ مزار کے قدموں میں اُس کی سادہ سی قبر تھی، پائنتی املی کا ایک جغادری پیڑ ہوا کرتا تھا جس کی چھال جلانے سے صندل کی خوشبو آتی تھی۔

ہر سال ردولی والے غازی میاں کی بارات لے کر آتے ہیں۔ سرِ شام ہی سے بچوں کو سُلا دیا جاتا تھا کہ رات کو تین بجے بارات پہنچے تو جگا دیا جائے۔ منہ پر جلدی جلدی پانی کے چھپکے مار کر سوئی سوئی آنکھوں سے بارات دیکھنے کوٹھے پر چڑھ جاتے۔ کتنے سال ہو گئے مگر آنکھوں میں اب تک وہ بارات سجی ہوئی ہے۔ آگے آگے سفید گھوڑا۔ سونے چاندی کے زیورات میں غرق پھولوں سے ڈھکا ہوا۔ سہرے کی لڑیاں گھوڑے کے سموں کو چومتیں۔

"وہ دیکھو، وہ بالے میاں"، ہمیں واقعی وہ گھوڑے پر بیٹھے نظر آنے لگتے"

اُس کے پیچھے سرخ شبنم کے پردے پڑی پالکی جس کے وسط میں کلام مجید رکھا ہوتا اور ایک شمع روشن ہوتی۔

"دُلہن دُلہن" ہم مسحور ہو جاتے۔ شمع کی تھرتھراتی ہوئی لَو سرخ شبنمی پردوں کے پیچھے سے بالکل شرمائی لجائی دلہن کی طرح لگتی تھی۔ دلہن کے بعد براتی ہاتھوں میں روپہلی سنہری موتیوں کی جھالریں لگی، چھوٹی چھوٹی چھتریاں جن پر سلمہ ستارے کا کام کیا ہوتا تھا، پھیکیوں کی طرح گھماتے جھومتے ناچتے جوق در جوق امڈتے چلے آتے۔ آنکھیں خیرہ ہو جاتیں کئی کئی دن تک پتلیوں میں چھتریاں ناچتی رہتیں۔



کبھی کوئی بہت ہی خوبصورت چیز دیکھو تو جی بھر آتا ہے۔ قدسیہ خالہ جی تو ہر دم بھرا ہی رہتا تھا، بس چھلکنے کے لئے بہانہ کی ضرورت ہوتی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھے وہ لمبے لمبے آنسو بہائے جاتیں۔

بارات دیکھ کر اُن کا کلیجہ کٹنے لگتا تھا۔ سب ہی اداس ہو جاتے تھے۔ یہ بارات تھی یا جنازہ۔ ایک ننھی سی کمزور لڑکی پر زندگی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں وہ اپنے خوابوں کی دنیا بنا کر ایک چھوٹی سی چھتری کھولنا چاہتی، مگر ناسمجھ انسان اجازت نہیں دیتے کیونکہ وہ اُن کے یقین میں رخنہ ڈالنا چاہتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے کہ ان کا سارا یقین چکنا چور کر کے منہ موڑ لیتی۔

مگر شبیر ماموں نہ تو کنہیا جی تھے، نہ غازی میاں تھے۔ وہ تو نہایت ادھورے

اور کھوکھلے انسان تھے، وہ قدسیہ خالہ کی زندگی میں پھنکارتے ناگوں کو اپنی بانسری سے
پھولوں کی مالا نہیں بنا سکتے، نہ اُن کی روح پر لپھڑے ہوئے گوبر کو اپنے یقین کے بل
بوتے پر چندن بنا سکتے۔ اُن کی دولت تو وہ لرزتے ہوئے ہاتھ تھے جن سے وہ مچلتی ہوئی
آرزوؤں کا گلا گھونٹنا خوب جانتے تھے! اور قدسیہ خالہ چھبیس برس کی عمر میں بھولی ہوئی
بات بنی سسک رہی تھیں۔ ان میں اتنی ہمت بھی تو نہ تھی کہ بوا کی طرح پاگل ہی ہو
جاتیں اُن سے بھی لوگ ڈرنے لگتے۔ اُن کے "غازی میاں" پر تو سب ترس کھاتے تھے اور مذاق
اڑاتے تھے۔ بہت سے مُردے زندہ لوگوں سے زیادہ جی دار ہوتے ہیں۔

بوا قدسیہ خالہ سے کچھ ہی بڑی ہوں گی۔ عورت کے دل میں کمسنی ہی سے ہزاروں
خوف بھر دیئے جاتے ہیں۔ جوانی کو وہ ایک کچی ٹھلیا سمجھنے لگتی ہے جسے قدم قدم پر کنکریوں
سے واسطہ پڑتا ہے۔ بوا کی دیوانگی نے دل سے اور بہت سے خدشوں کے ساتھ عزت آبرو
لٹنے کا خوف بھی خرد برد کر دیا تھا۔ کچی ٹھلیا کے بجائے وہ ٹھوس گولا لڑھکاتی تھیں
مردانہ وار اندھیرے اجالے جہاں جی چاہتا چلی جاتیں۔ کچھ ایسی دہشت بٹھا دی کہ لوگ
مان گئے۔ نہ جانے کس طرح دو چار معجزے ہو گئے جو یقین بن گئے۔ ایک دفعہ کسی بدمعاش
نے انھیں اکیلا پا کر دبوچنا چاہا، غازی میاں نے اس زور کا لپڑ رسید کیا کہ اس کا تھوبڑا
وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا۔ ایک اور کم نصیب الجھا تھا۔ سنتے ہیں جس ہاتھ سے اُس نے اُن
کی کلائی پکڑی تھی وہ سڑ گل کر گر گیا۔

چچا میاں تو مُرتد تھے ہی، کہا کرتے تھے: "درگاہ میں ہر سال ہزاروں کوڑھی شفا کی
آس لگا کر آتے ہیں، ہاتھ پیر سڑ گل کر گر جانا معجزہ نہیں بیماری ہے اور شرابی کو لقوہ مار جانا
بھی کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں"، مگر ہمیں تو بوا پر شک کرتے ڈر لگتا تھا کہ کہیں تھوبڑا
وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا تو کیا کر لیں گے۔ بڑی جناتی طبیعت پائی تھی۔ پر جب سے معلوم ہوا
تھا ذرا سی پاگل ہیں جھنجھنی دیتی نہیں تو ہمیں اُن سے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ ایک دن بر گد

کے پیڑ کے نیچے کھڑی سیلپر اتار کر مٹی جھاڑ رہی تھیں، ہم نے قدسیہ خالہ کا پیغام انھیں پہنچا دیا۔

"نہ آئیں گے"، بڑی رکھائی سے بولیں "جب ہم راجی کر ہے آجادیں گے"۔ اور پلیا سے گزر کر جو پگڈنڈی جاتی تھی ادھر ہولیں۔

پھر خدا خدا کر کے ایک دن اُن کا جی کرا اور وہ چوکھٹ سے آگئیں۔ نہایت بے تکلفی سے بغیر کسی سے بولے چالے، پانی پینے کے مٹکوں کے پاس گئیں۔ ایک کٹورا پانی پیا۔ تھوڑا سا آنچل میں بندھی بیلے کی کلیوں پر چھڑکا پھر آنچل سر پہ دھر لیا اور بالکل باہر والیوں کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگیں۔ اماں ہمیشہ کہتی تھیں کہ شریف زادیاں کولھے پہ ہاتھ رکھ کے نہیں کھڑی ہوتیں ایسے باہر والیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک ایسی بھی عمر ہوتی ہے جب ہاتھ وبال جان ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا انھیں کہاں رکھا جائے۔ تو اس خوف سے کہ باہر والی کہیں نہ بن جائیں سر پہ ہاتھوں کی پالتی مار کر رکھ لیتے۔

"اے ہے نگوڑی سر کیوں پیٹ رہی ہو"۔ تب اماں بڑ امانتیں۔

"پھر کہاں رکھیں؟" ہم عاجز آجاتے۔

"چولہے میں"۔ وہ اور جل جاتیں "غارت ہو یہاں سے اور ہم وہاں سے غارت ہو جاتے۔

بوا ایکدم آپ ہی آپ ہنسی پھر چوکی پر بیٹھ کر تنگ پاجامہ کی چوڑیاں سنوارنے لگیں۔ اُن کے کپڑے بہت اُجلے لگ رہے تھے۔ گلابی دوپٹہ کلف دے کر مروڑا ہوا کندھوں پڑا تھا۔ بیلے کی کلیوں کا گچھا آنچل میں بندھا کنپٹی پر جھول رہا تھا۔

انھیں گھورتے دیکھ کر قدسیہ خالہ نے کھٹ سے آنکھیں جھکالیں اور بیکار ہی تن ڈھکنے لگیں۔

دھنا روئے روئے انکھیاں لال گال۔ وہ قدسیہ خالہ کو جیسے چڑا کر گا رہی تھیں۔

پات پچاسی کے بیڑا لگائے۔
ہمرے نٹھور پیا ا جہو نہ آئے۔
دھنا روئے روئے ـــــ انکھیاں
قدسیہ خالہ تو پلّو میں آنسو لیے بیٹھی رہتی تھیں۔ بس چھیڑ کنے لگیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ دوہرہ ڈال پاتیں بُوا تڑک کے باغ والے دروازے سے غائب۔
"چن چن کلیاں سیجیں بچھائیں" دور اُن کی آواز لہرائی۔
دھنا روئے روئے انکھیاں...... لال گال۔
سب پر رعب طاری ہو گیا۔ بُوا غیب دان ہیں۔ قدسیہ خالہ کو جھٹ سے پکڑ لیا۔
"کہیں سن چکی ہو گی" چچا بولے دہریئے تھے نا۔ مگر ان کی بات کا کسی نے یقین نہ کیا۔ اس کے بعد وہ آنے جانے لگیں، آتیں، بیٹھتیں، جی گھبراتا اٹھ کر چل دیتیں۔
"اے بیٹھو نا بُوا......" قدسیہ خالہ خوشامد کرتیں۔
"ناہیں بھائی ہم کا جائے کا پڑی ہمری باٹ دیکھت ہوتئے" اور ہم سمجھے واقعی غازی میاں کدم کی چھیاں تلے کھڑے اُن کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔
"اچھی بھلی شریف گھرانے کی ہے۔ نگوڑی کی مت ماری گئی"
"ہتیں بی مجھے پاگل تو نہیں لگے ہے"
"اوئی تو کیا ڈھیلے مارے جب ہی مانو گی کہ پاگل ہے۔ گھر میں چڑیا کو گھسا رکھا ہے موئی کوڑی کی دیوال نہیں۔ جس کا جی چاہے۔ دکھیا کو لوٹ لے، خبر بھی نہ ہو گی۔
"اے بی اس کا ذکر نہ کرو میرے جی میں وہم آتا ہے" نانی اماں بولیں۔
توکیا میں اُس کے بُرے کو کہتی ہوں؟"
اُس کے اچھے بُرے کا کیا ٹھیک یہ مولوی صاحب نے بھی اس کے بھلے ہی کو کہا تھا کہ شرع کر لو یوں ماری ماری پھرتی ہو۔ یہ اُن کی جان کو آ گئیں کہ اپنی اماں کا نکاح پڑھا دو کسی راہ

چسیلتے ہے۔"

"بغیر مرد کے عورت کی عزت محفوظ نہیں ہوتی" مولوی صاحب نے سمجھایا۔

"ہمارا مرد موجود ہے۔ تمہارے باپ کا باپ۔ سُن بھئے تو تمہاری ڈاڑھی ماں آگی لگائی دیجیئے۔"

غازی میاں کی پیاری کو کوئی کچھ کہے اور وہ چپ چاپ سن لیں۔ مُلّا جی کا جوان بیٹا باؤلی سے ڈول بھر کے مڑا۔ ہاتھا کر سانپ نے ڈس لیا۔ مُلّا جی نے بوا کے تلوے چاٹے جوتی پہ ناک رگڑی تو لڑکے کی جان بچی۔

"پانی کا سانپ ہوگا۔ زہریلا نہیں ہوتا۔ چچا میاں کا کہنا تھا۔ مگر کون سنتا ہے۔ اپنے ایمان کے آگے؟ لوگ بوا سے اور بھی ڈرنے لگے۔ ایسی ویسی نہ تھیں "میاں" کی چہیتی محبوبہ تھیں! غازی میاں جو بانجھ کی گود میں پھول کھلاتے، کوڑھی کا کوڑھ مٹاتے۔ ایک پل میں فقیروں کو شاہ اور شاہوں کو کنگال بنا دیتے۔ کیا اپنی لاڈلی کا اتنا مان نہ کرتے ہوں گے قدسیہ خالہ کو اب بھی امید تھی کہ شاید میم بانجھ ہے چونکہ ابھی تک چہیے کا بچہ تک نہ جن پائی تھی۔ نانی بیوی کے چِلّوں اور وظیفوں نے اس کی کوکھ پہ تالا ڈال رکھا تھا۔ مولا کو دن پھیرتے دن نہیں لگتے۔ میاں کے مزار پہ منت بھی مان رکھی تھی کہ خیر سے قدسیہ کے دن پھر گئے اور گود بھری تو چاندی کا پُتلا چڑھائیں گی۔ تین سال سے نانی بیوی چاندی کا پالنا میاں کے قدموں میں چڑھا رہی تھیں کہ یا غازی میاں یہ پالنا بھر دو۔ ادھر تو قادر سے سفارشیں جاری تھیں کہ قدسیہ کے دولہا کو حاضر کریں۔ مگر چلّے وظیفے اور دعائیں کچھ خلط ملط ہوگئیں۔ پالنا بھرا مگر میم کے وسیلے سے جس دن سوتن کے ہاں بچی پیدا ہونے کی خبر ملی قدسیہ خالہ اور بھی زمین دوز ہوگئیں۔ جیسے اُن کی کچی قبر پہ سنگِ مرمر کا مزار کھڑا کر دیا گیا۔ اب تو روزِ حشر منکر نکیر کو اُن میں جان ڈالتے ہوئے آلکس آئے گی۔ بوا کئی دن سے نہ جانے کہاں غائب تھیں ایکدم سے آن دھمکیں۔ نانی بیوی

اُس نائن کی خبر لے رہی تھیں جو لڈو دینے آئی تھی۔ نانی بیوی نے لڈو موری میں لڑھکا دیئے اور نائن کا چونڈا مونڈنے کی دھمکی دینے لگیں۔ وہ لنگوڑی بھاگی اپنا لہنگا سنبھالتی۔ بوا نے جو بچی کی پیدائش کی خبر سنی تو باؤلوں کی طرح جھکنے لگیں۔

"اے بڑی بٹیا، سوتیا کی گود ہری ہوئی گی۔ سٹورا اچھوانی بنہٹیو!" پھر کھونٹی سے ڈھولکی اُتار کے اوندھی سیدھی زچہ گیریاں الاپنے لگیں۔

"پیر میں پینجنیاں لالہ چھم چھم کھیلے گا" لالہ تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ چھم چھم خاک کھیلے گا۔ نانی بیوی کو یہ بے وقت کی راگنی کھل گئی۔ وہ ٹانگ لے کر بولنے ڈھول ایک طرف لڑھکایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی مسجد کے پچھواڑے جا بیٹھیں۔ بوا کئی دن کے لئے اُڑن چھو ہوگئیں۔ ان کی یہی عادت تھی، دن ہو کہ رات جب وحشت بڑھتی پیدل نکل کھڑی ہوتیں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں نکل جاتیں۔ کوئیں کی منڈیر پر گھڑی بھر کو دم لیتیں۔ کوئی نیا گیت سنائی پڑ جاتا تو اُسے سمیٹ کر اپنے گیتوں کے خزانے میں جمع کر لیتیں پھر آگے بڑھ جاتیں کئی کئی دن بنا کھائے چلتی چلی جاتیں۔ پاگلوں میں بڑا دم ہوتا ہے۔ سوتے ہوئے ہم نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ انھیں سانپ بچھو چھیڑتے نہ جنگلی جانور، ترائی کے ادھر گاؤں میں شیر لگتا تھا، مگر انھیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتا، کچھ لوگ تو کہتے تھے وہ انھیں ماتھا ٹیک کے سلامی دیتا تھا۔

ایسے وثوق سے بوا غازی میاں کی شرارتوں کے قصے سناتیں کہ شک کرنے کی گنجائش نہ رہ جاتی۔ درگاہ کے پاس رہ کر ہر بات یقین آنے لگتی ہے۔ میاں بڑے ضدی اور ہٹیلے تھے، ہر وقت چھیڑ خانیاں کیا کرتے۔ کبھی آنچل پکڑ کے کھینچ رہے ہیں، کبھی چوڑیاں مُرکائے دیتے ہیں۔

اے بی میاں تم پر عاشق کیسے ہو گئے؟" قدسیہ خالہ پوچھتیں۔

دل آئے گیا!" بوا نخرے سے مسکراتی۔

یہی تو پوچھتی ہوں دل کیسے آیا؟" قدسیہ خالہ کو دل لانے کے گر معلوم کرنے کی بڑی فکر رہا کرتی تھی۔ تن من دھن نچھاور کرنے کے بعد بھی انھیں تو کسی کا دل نہ ملا۔

"اب ای ہم کا بتا دیں ان ہی سے پوچھ لو۔ ای کا سامنے کھڑے مسکراوت ہیں۔" وہ سپاٹ دیوار کی طرف ٹھینگے سے اشارہ کرتیں اور سب ڈر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ ہماری مادّی آنکھوں کو کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اُن کے لئے تو چودہ طبق روشن تھے۔

"ملاقات کیسے ہوئی؟"

"پنیا بھرن جات رہیں، باٹ روک کے کھڑے ہو گئے!"

"پھر؟" ہم ان کے پاس کھسک کر پوچھتے۔

"ہم اینٹھ کے بھاگیں۔ بس ہمری کلائی پکڑ لیہن!"

"پھر؟" ہم اور کھسکتے۔

"ہمرا باپو گُسّائے گئے؟" وہ کہیں دور خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتیں۔ "کہن ماجھی کا پوت ہے ہم اپنی دھی نہ دیں گے۔"

"ماجھی کا پوت؟"

پھر وہ بتاتیں کہ مادّی آنکھوں کے لئے میاں ایک ماجھی کے بیٹے کا روپ دھار کے اُن کے باپو سے پیر پکڑ کے انھیں مانگنے آئے تھے۔ باپو گُسّائے گئے اور انھیں دھتکار دیا پھر اُن کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی۔ رات کو جب برات گھاگرا ندی پار کر رہی تھی زبردست طوفان آیا۔ میاں جو ماجھی بنے اُسی نوکا کی پتوار سنبھالے تھے، وہی طوفان لائے تھے انھوں نے سب کو چھوڑ کر انھیں بچانے کی کوشش کی مگر براتیوں نے گڑبڑ شروع کر دی۔ گُسّے کے مارے میاں نے نوکا الٹ کر سب کو ڈبو دیا اور بوا تین دن تک پانی پر دلہن بنی پھولوں کی سیج پر تیرتی رہیں۔

"پھر؟" ہم کھسک کر بالکل اُن کی گود میں گھس جاتے۔

"میھی تمہارا کھوبڑا" وہ اکتا کر ہمیں دور دھکیل دیتیں اور کھوئی کھوئی آنکھیں لئے قبرستان میں ہرہے گاتی سرگرداں گھومتیں۔ بوا کنواری تھیں۔ کسی مٹی کے پتلے نے انھیں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بارات کے ڈوبنے کے بعد وہ کسی طرح کنارے سے لگ گئیں۔ کئی دن جنگلوں میں سرگرداں پھرتی رہیں۔ جب اُن کے والدین کو اُن کا پتہ چلا تو دوڑے آئے مگر جب تک بوُا اپنے خوابوں کی دنیا میں پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سہاگن تھیں اور بالے میاں اُن کے دولہا تھے۔ بالے میاں سے الجھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

"اوپر کا بلا دت ہیں"؟ اُن کا جب جی چاہتا نکل کھڑی ہوتیں اور جنگلوں میں عشقیہ لوک گیت گاتی پھرتیں۔ اُن کی مرضی کو بالے میاں کی مرضی اور خدا کا حکم سمجھ کر کسی نے چوں نہ کی۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کے بارے میں معجزے مشہور ہونے لگے تو اور بھی لوگوں کی اُن سے کنی دبنے لگی۔ وہ پوجی جانے لگیں۔ لوگ میاں سے سفارش کرانے کے لئے اُن کی سیوا کرتے۔ جدھر نکل جاتیں آنکھیں بچھاتے۔ اُن کا کام کرنا خوش قسمتی سمجھتے جس کی مراد پوری ہوتی وہ غازی میاں کے مزار پہ چڑھاوا چڑھانے کے ساتھ ان کے لئے بھی گلابی دوپٹہ اور تیل عطر پھول چوڑیاں نذر کرتا، کھانا وہ کھاتی ہی کتنا تھیں کئی کئی دن بھوکی رہ لیتی تھیں۔ لوگ تھال سجا کر اُن کے گھر دے جاتے وہ اٹھا کر فقیروں کو کھلا دیتیں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ اسی طرح اکیلی رہتی تھیں۔ ایک چمارن گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ دنیا بھر کے کپڑے پھاڑنے اور کھونے والی دھوبن اُن کے کپڑے سب سے اُجلے دھوتی تھی۔ تھوڑی بہت زمین بھی تھی مگر انہوں نے وصولی کبھی ضروری نہ سمجھی۔ شائد یہی وجہ تھی کہ لوگ انھیں غازی میاں کی پیاری ماننے لگے تھے۔ وہ انھیں بھی پیاری تھیں انھیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہ تھی ان پر جان نچھاور کرنے والے بہت تھے اسی لئے وہ ایک کمزور عورت ہوتے ہوئے بھی اپاہج اور مجبور نہیں تھیں۔ مردوں کے تمام حقوق انھیں حاصل تھے

رات برات اکیلی جہاں چاہتیں اونچی آواز سے اعلان عشق کر دیتیں، اونچی آواز سے الاپتیں، آوازے کستیں، دھڑلے سے گالی بک دیتیں۔ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر قوالی سنتیں اور چھنا چھن روپے پھینکتیں۔ غازی میاں کے سالانہ میلے کے زمانہ میں لاکھوں زائرین کے ہمراہ لچے بدمعاش بھی آنکلتے، آئے دن اغوا اور آبرو ریخیتی کے واقعات سننے میں آتے بیگمیں بند شکرم میں چپراسیوں کے پہرے میں نکلتے خطرہ محسوس کرتیں اور وہ مزے سے بھیڑ کو چیرتی گلابی آنچل لہراتی پھرتیں۔

"اے ہے بُوا زمانہ بڑا خراب ہے میلے میں نہ جاؤ۔ اماں انھیں ٹوکتیں"۔ اکیلی گھومتی ہو ڈر نہیں لگتا"۔

"کون ہم اکیلے گھومت ہیں؟ ارے ہم اکیلے نا ہیں، ہمرا ساتھ اُو جو رہت ہیں یعنی اُن کے"وہ" "مجال ہے کوئی کی جو ہم سے بولے"۔

سب لاجواب ہو جاتے۔ کون اُلٹی سیدھی بات کہہ کے آفت سر مول لے، کون جانے معجزہ ہو جائے تو؟

"سالی لفنگی ہے؟" شروع شروع چچا میاں اُن سے چڑتے تھے بکواس کر دیا کرتے تھے۔"پاگل واگل کچھ نہیں سب کو اُلّو بناتی ہے!"

اُسی رات چچا میاں کے ایسا گردے میں درد اُٹھا کہ چیں بول گئے۔ لاکھ بیچارے نے بحث کی کہ دردِ گردہ کا انھیں پرانا مرض ہے۔ مگر صاحب کون سنتا ہے۔ اماں نے بُوا کو خوب پرچایا، اُن سے دبی زبان سے کہا کہ میاں سے سفارش کر دیں۔ بیچارے جاہل ہیں۔ درد کم تو ہونا ہی تھا مگر اماں نے اُسے بُوا کی سفارش کا اثر ہی سمجھا اور چچا میاں کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اب انھوں نے ایسی ویسی بات کہی تو سر پیٹ لیں گی۔ اُن کا کیا ہے نگوڑے ناتھے جورو نا جاتا اللہ میاں سے ناطہ۔ وہ تو خیر سے بچوں والی ہیں وہ کسی سے بیر نہیں پال سکتیں۔ آپا کو تو انہوں نے پہلے ہی قسم دلا دی تھی کہ اگر بُوا

کی شان میں ایک لفظ بھی کہیں تو اُن کا مرا منہ ہی دیکھیں۔" اَبا کہتے تھے یہ پیری مُریدی بدعت ہے۔ مگر اماں کو عاقبت سے زیادہ اپنا سہاگ پیارا تھا۔

جب بُوا اور گھل مل گئیں تو ایسا لگا جیسے اللہ میاں سے سمجھوتہ ہو گیا۔ بُوا کے ناطے غازی میاں بھی اپنے کچھ لگتے تھے۔

موڈ میں ہوتیں بُوا تو کبھی رات کو بھی رہ جاتیں۔ ہم لوگ اُن کے ساتھ سونے کے لئے لڑا کرتے۔ انھیں سونگھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بھینی بھینی تازہ کھدی ہوئی مٹی کی سی مہک آتی تھی۔ کئی دن غائب رہنے کے بعد جب دور سے اُن کے گانے کی آواز سنائی دیتی تو ہم لوگ پاگلوں کی طرح غل مچاتے دوڑتے، چیونٹیوں کی طرح لپٹ جاتے اور انھیں گھسیٹ لاتے۔ وہی آواز جسے سن کر روح فنا ہوا کرتی تھی۔ پھر لحن داؤدی کا اثر کرنے لگی اُن کے آتے ہی گھر کی فضا جاگ کر کھلکھلا اٹھتی —— ڈھول گمکنے لگتا۔

"ہو مورے راجہ۔ دلی سی بید بلانا۔

بیچ بہری دیکھیے دھیر رے دھیر" وہ نئے گیت نئی دھنیں سناتیں:

"ساون آئے گوا مجھائی کا جھولا نہ پڑے رہے۔" گھٹائیں جھوم کر آتیں پھواریں پڑتیں جوان دلوں میں اُمنگیں انگڑائیاں لینے لگتیں۔ قدسیہ خالہ کی آنکھوں میں چنگاریاں سلگنے لگتیں جھولا کون ڈالتا، قدسیہ خالہ کو تو جھولا جھولتے دیکھ کر چچا اور نتلی شروع ہو جاتی مگر بُوا کسی کے گھر سے رسّی کا ٹکڑا اٹھا لاتیں۔ ہم رسّی پر تکیہ رکھ رکھ کر جھولتے۔ بوا لمبی لمبی تانیں اٹھاتیں۔ اُن کے ساتھ پلنگڑی پر لیٹی قدسیہ خالہ بھی آواز ملانے لگتیں۔

"جیا ترسے بدروا برسے

سکھی ری دن کیسے کٹیں گے بہار کے"

شبیر ماموں دور بیٹھے مجرموں کی طرح زرش کو گھورتے جیسے وہی بادل برسا کر کسی کا جی ترسا رہے ہیں۔ اور قدسیہ خالہ کی زندگی کی بہار کے دن جو کٹھن بیت رہے

ہیں اس کی ذمہ داری انہی پر آتی تھی۔ قدسیہ پرائی تھیں۔ وہ تو شجرِ ممنوعہ تھیں۔ چپکے۔ چپکے مولویوں سے فتوے لیے۔ وکیلوں سے بات چیت کی۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب خلع بل پاس نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو خاندان کی ناک کٹنے کے ڈر سے طلاق کا خیال بھی کسی نے نہ کیا، پھر جب خاندان کے کچھ باغی لوگوں نے نانی بیوی کو راضی کیا تو قدسیہ خالہ کے دولہا کو ضد سوار ہوگئی۔ بولانے اپنی ایک آزاد دنیا بنالی تھی جہاں وہ دنیا کو ٹھوکر مار کے راج کرتی تھیں مگر آخر کو عورت تھیں۔ لاکھ دروازے بند کیے پھر بھی کوئی جھری رہ گئی۔ یہیں وہ واقعی اچھی لگتی تھیں۔ اُن سے پیار بھری ضدیں کرتے۔ وہ جاتیں تو ماتم کناں پیچھے لگ جاتے۔ ناچار لوٹ آتیں۔

بُوآ یہ بچے تو تمہارے پیچھے دیوانے ہوگئے ہیں۔ ان کمبختوں کو بھی اپنے سنگ لے جاؤ" اور بُوا اپنا دورہ ملتوی کر دیتیں۔ بوا پاگل نہ ہوتیں تو سونے میں تولنے کے قابل تھیں۔ کام کاج میں بھی ہاتھ بٹانے لگی تھیں۔ صفائی کا انھیں جنون تھا۔ بچوں کی فوج لے کے جدھر پل پڑتیں ٹوکروں کوڑا نکال پھینکتیں۔ ابا کی پنشن کے بعد وطن چلی چلیں تو کیا کہنے۔

"کیا اس کا علاج نہیں ہو سکتا" اماں نے حکیم صاحب قبلہ سے پوچھا جو قدسیہ خالہ کا علاج کیا کرتے تھے اور دوسرے تیسرے آتے رہتے تھے۔

"ہو کیوں نہیں سکتا بیگم صاحب! دنیا میں کونسا مرض ہے جس کا طب میں علاج نہیں۔ مسہل دیئے جائیں انشاءاللہ دماغ صحیح حالت پر آجائے گا۔"

حکیم صاحب قبلہ کے پاس ہر مرض کی بس ایک دوا تھی۔ املتاس کے جلاب۔! جب قدسیہ خالہ کو بہت وحشت ہوتی تو یہی جلاب دیئے جاتے ان جلابوں سے جان کے ساتھ جسم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنے کا یقین ہونے لگتا۔ دو بصحت ہونے کے سوا بیچاری کو کوئی صورت نظر نہ آتی۔ پھر کافی دن تک وہ پلک جھپکاتے بھی ڈرتی تھیں کہ لوگ اسے

دورہ سمجھ کر کہیں علاج پر نہ تل جائیں۔ چچا میاں کو بھی دردِ گردہ کے لیے وہی جلاب دیے گئے پہلی خوراک کے بعد وہ حکیم جی کو قتل کرنے کے ارادہ کرنے لگے۔

"جسم کی گرمی دماغ پر چڑھ جاتی ہے۔ پیٹ کی صفائی سے تمام فاسد مادے خارج ہو جاتے ہیں،، وہ مسہل کے فوائد بیان کرتے اور ہر کوئی قائل ہو جاتا۔ مگر بوا سنی ان سنی کر دیتیں۔

"اے رہن دیو۔ ای بید کا بچہ کا ہمرا علاج کرہئے۔" اُن کی بیماری پر زیادہ بحث بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایکدم اکتا کر بھاگ کھڑی ہوتیں۔

بوا کے علاج کی بات چل ہی رہی تھی کہ ایک دردناک واقعہ پیش آیا کہ اُن کا پاگل پن کھل گیا۔ سنجلی بیچاری ذرا مُشمُشی سی تھی۔ اُس کی شادی میں مستقل اڑچنیں پڑا کرتی تھیں۔ بڑے جوڑ توڑ کے بعد سہارنپور والی خالہ بی ایک پیغام گھیر کے لائیں۔ دولہ کی اماں بات چیت کے سلسلہ میں آئیں۔ اُن پر رعب ڈالنے کے لیے اتنا گھر جھاڑا پونچھا گیا کہ ہم خود اپنے گھر میں مہمان سے لگنے لگے۔ ہر طرف ایسی چیزیں سجا دی گئیں جن کے میلے ہو جانے اور ٹوٹنے کے ڈر سے ہر وقت ڈانٹ پڑتی۔

بوا کئی دن سے غائب تھیں۔ ہم انھیں تین چار دن رو پیٹ کے ناامید ہو چکے تھے ہونے والی سمدھن کے لیے نہایت لمبا چوڑا دسترخوان چنا جا رہا تھا بیلے کی کلیوں کا گچھا آنچل میں جھلاتی کوئی نیا گیت مرمراتی حسب عادت اچانک آگئیں۔ پہلے تو گھر کے سو لہ سنگھار دیکھ کر ٹھٹکیں پھر سمدھن کو دیکھ کر ایکدم الف ہو گئیں۔ اُن کے بہت قریب جا کے آنکھیں مچمچائیں، بھنویں سکیڑیں جیسے کوئی بہت باریک سی جوں ڈھونڈ رہی ہوں حالانکہ سمدھن خاصی واضع تھیں۔ ٹھنگنی تو ضرور تھیں مگر قد کی لمبائی کی کمی چوڑائی میں پوری ہو گئی تھی۔ بوا کے رویّے سے اماں ذرا گھبرائیں۔ اُن کا دھیان بٹانے کے لیے اِدھر اُدھر کی فضول باتیں کرنے لگیں۔ مگر بوا نے اُن کا ہاتھ جھٹک دیا اور سمدھن سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"اے بہنی، کون چکی کا پسا کھات ہو؟"

سمدھن کے چہرے پہ بہت سے عضلات پھدکنے لگے۔ سیاہ اور چکپنی ناک میں ہیرے کی لونگ بھڑکنے لگی اور ایسا لگا سمدھن ایک دھماکے سے پھٹنے والی ہیں۔

"اے بوا ذرا یہ برف کا پانی مردان خانہ میں لے جاؤ" انہوں نے بوا کو گھسیٹ کر سمدھن کی جان بچائی۔ سنجھلی کا پیغام آیا ہے۔ دولہا باہر بیٹھا ہے۔ ذرا دیکھکر تو آؤ کیا ہے" اماں نے پھسلا کر انھیں باہر بھیج دیا۔

نگوڑی سٹرن ہے" اماں نے معذرت چاہی۔

مگر سمدھن کبیدہ خاطر ہو گئیں۔

بوا گئیں، اور اُلٹے قدموں لوٹ پڑیں۔ برف کے گلاسوں کی کشتی انھوں نے دھم سے چوکی پہ پٹخی اور ماتھا کوٹنے لگیں "اے موری بٹیا۔ ای دولہا ہے کہ تمبا کو کیر پنڈا اوپرسے بیت بھر کا!" انہوں نے داہیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ بائیں ہاتھ کا بالشت بنا کر کھڑا کیا۔ "بھائی ای جوڑی نکو ٹھیک نہیں۔ دولہا کونی کام کا نہیں۔ کاہے بٹیا کا نصیب پھوڑت ہو۔ اے سمدھن کونی اپنی شکل کی پری جات ڈھونڈ کر لاؤ پوت کے لئے، ہمری بٹیا کا بخسو!"

سمدھن پھٹیں تو نہیں لیکن سنجھلی کو انہوں نے اسی وقت بخش دیا۔ بوا نہایت خفا گلیاتی رہیں۔ اماں کے قابو میں خاک آتیں۔ کھونٹے سے ڈھول اتار کے کھردا تال اڑانے لگیں۔

کالا بلم ہم نہ لیئے دیدی۔ کالا بلم
جب مورے سیّاں سیجوں پہ آئیں ہیں
اُس مارون لات اُتان گرے دیدی۔
کالا بلم ...... ہم نہ لیئے۔

منجھلی کے نصیب میں اڑچنیں ہی لکھی تھیں۔ سارے گھرنے بوا کی ٹانگ لی مگر ڈھول لڑھکا کے وہ بڑبڑاتی چلی گئیں۔

"کواں ماں ڈھکیل دیو دھی کا ــــ ہاں ــــ"

ہفتوں کے لئے غائب ہوگئیں۔ ایسا لگا جیسے اب کبھی نہیں آئیں گی۔ گھر میں سونا پڑ گیا۔ قدسیہ خالہ کے دورے پھر جلدی جلدی وارد ہونے لگے۔ مزاج بھی بہت جھلا ہوگیا۔ پہلے تو ہر بات نانی بیوی کی مان لیتی تھیں۔

اے بیٹی قدسیہ ذرا سا دودھ پی لو۔"

"اچھا بی اماں"

"بیٹی اب لیٹ جاؤ کب سے کھونٹا سی بیٹھی ہو"

"اے ہے کب تک پڑی رہو گی۔ اب اٹھ بیٹھو"

غرض اٹھ بیٹھو، کھاؤ پیو، نانی بیوی کی جان کو قدسیہ خالہ روگ کی طرح لگ گئی تھیں۔ ہر وقت انھیں کا ماتم! ہر دم نگاہیں انھیں پر جمی رہتیں اس کے سوا کام ہی کیا تھا انھیں قدسیہ خالہ ہر بات پر "اچھا بی اماں" کہے جاتیں۔ ایکا ایکی نہ جانے کیوں نانی بیوی کو جھڑکنے لگیں دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگتی۔ کبھی قدسیہ خالہ روتیں کبھی نانی بیوی بیچ میں دادی اماں بھاند پڑتیں۔ ایک ایک کرکے سب لپیٹ میں آجاتے دو پارٹیاں بن جاتیں۔ بات کہیں سے شروع ہو کے کہیں ختم ہوتی۔ ددھیال اور ننھیال دو کیمپ بن جاتے۔ سات پیڑھی تک حملے ہونے لگتے، پھر منہ تھوتھائے سب ایک دوسرے سے تنے رہتے۔

سب لڑائیاں قدسیہ خالہ کے مورچہ سے شروع ہوتیں۔ دن بدن اُن کی طبیعت میں تلخی بڑھتی جارہی تھی۔ خوب لوگوں کے دل دکھتے اور انھیں مزا آتا۔ شبیر ماموں سے بھی وہ کھنچی کھنچی رہنے لگیں۔

میری بار کیوں دیر انہی کری۔ وہ قدسیہ خالہ کی دلپسند چیز سنانے لگے تو وہ بیٹھ
موڑ کر پڑ گئیں۔ بیچارے منمنا کے رہ گئے۔
"جائیے نا" پھر رات ہو جائے گی ـــــ برسات کا زمانہ ہے"۔ وہ رحم کھا کر
رکھائی سے کہتیں اور وہ کچھ احسان مند سے اٹھ کر چلے جاتے۔ خیال تو ہوا اُن کا۔
پھر ایک دن ہم خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ ہمیں مل گئیں۔ بہار کا موسم تھا۔ جنگل
ٹیسو کے پھولوں سے دہک رہے تھے۔ آنکھوں میں لال لال رنگ بھرا جاتا تھا۔ وہ ایک انگاروں
سے لدے درخت کے پاس رک کر اپنی سلیپر میں سے ریت جھاڑ رہی تھیں۔ گلابی ڈوپٹہ
پھولوں کے عکس سے آتشیں ہو رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں بہاریں رقصاں تھیں جیسے اپنے
محبوب سے مل کر آئی ہوں یا ملنے جا رہی ہوں۔
ہم لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے۔ محبت انسان کو کتنا بے بس کر دیتی ہے۔ ہماری بے
قراری پر وہ کھل اٹھیں۔ گلے میں موتی بجنے لگے۔
"ارے بھائی چلت ہیں، تنک دم تو لیؤ"۔ ہم انھیں گھسیٹنے لگے ایک بار انہوں
نے پیچھے ٹھٹک کر دیکھا۔ اور بڑی لجاجت سے کہا۔
"اَیتے لوٹ کے آوت ہیں!" ہم بوکھلائے وہ کس سے ابھی لوٹ کر آنے کا
وعدہ کر رہی تھیں۔ وہاں تو کوئی بھی نہ تھا! چلیں پھر رک گئیں۔ پھر بگڑ کر بولیں۔ "ہمسے
نخرے نہ کرو ہاں ہم کہے دیت ہیں"۔ پھر چلنے کو مڑیں مگر پھر جیسے کوئی ناگوار بات سنی
اور تیور چڑھا کر زور سے ڈانٹ کر بولیں" اچھا جاؤ نہ آئیں گے۔ دیکھت ہیں تم ہمرا کا
کر لیت ہو، ہمرا اعتبار ناہیں کرت ہو...... ہمری بلا ئے سے" وہ ہوا سے لڑ رہی تھیں۔
اور اپنی ٹانگوں کا یہ حال تھا کہ یہی جاتی تھیں۔ اگر ہم واقعی انھیں اتنا نہ چاہتے ہوتے تو
کبھی کے بھاگ کھڑے ہوتے۔
لوا کے آنے سے کائیں پائیں مچ گئی۔ نہ جانے کیا اتفاق تھا کہ جب وہ آتیں تو پاتو

کوئی پھلوں یا مٹھائیوں کا پارسل آجاتا یا کوئی ایسی ہی خبر آتی۔ انھیں دیکھ کر سب کے دل چونچال ہو جاتے۔ لڑائی ہو رہی ہوتی تو ختم ہو جاتی یا غل غپاڑے میں لوگ بھول جاتے قدسیہ خالہ اپنی نامرادی جھٹک کے اٹھ بیٹھتیں۔

باتیں کرتے بوا ایکدم تیوریاں چڑھا کر سپاٹ دیوار کو گھورنے لگیں۔

جاؤ ـــ نہ آدیں گے!" انھوں نے ہوا کو ڈانٹا۔ سب سہم گئے۔

"کیا ہوا؟" اماں نے پوچھا۔

"بھائی ہمرا مگج کھائے گوا۔ ہم پہ بھروسہ نہیں۔ کہت ہے ہمری آسنائی ہے! ہم نین لڑاوت ہیں۔ وہ چلا چلا کر بالے میاں کی شکایت کرنے لگیں۔ "ارے ہم کا سمجھت کا ہے ہم کوئی پتریا ہن کھانگی ہن؟"

"اُوئی!" اماں اداس ہو گئیں ـــ ہائے پگلی!" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری!

"جل کے مرنڈا ہو جات ہے۔ کہت ہے ہر جائی ہن!" وہ خیالی محبوب بالکل چوں چوں کا مربہ تھا۔ کچھ جیمس بونڈ اور کرشن مرادی کا کرشمہ سمجھ لیجیے۔ جیمس بونڈ تو زمانہ میں ہیرو رہ چکا ہے۔ وہ چاہے داستان امیر حمزہ کا ہیرو ہو، حاتم طائی ہو یا الہ ادول کی صورت میں ظاہر ہو۔ اور کرشن مرادی کی جھلک شاید اس لیے تھی کہ زیادہ تر لوک گیت انھیں کی شان میں ہوتے ہیں۔ بالے میاں بالکل وہی شرارتیں کرتے تھے آنچل پکڑنا، کلائی مروڑ کر چوڑیاں مرکا دینا اور کبھی غصہ آجائے تو لپٹر مار دینا یا کشتی لوٹ دینا۔ ان میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک طرحدار نوجوان میں ہونا چاہئیں۔ کچھ بھی ہو بوا کے بالے میاں قدسیہ خالہ کے شبیر ماموں سے زیادہ زندہ اور دلچسپ تھے ہمیں بوا کے ہر بات یقین آجاتی انھیں میاں دکھائی دیتے تھے تو اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔ ہمیں خود بادلوں میں ہاتھی گھوڑے اور میلی پرانی نونی لگی دیواروں کے اکھڑے ہوئے پلستر میں اندر سبھا کا اکھاڑہ جما نظر آتا تھا۔ ہمیں تو وہ پاگل بھی نہیں لگتی تھیں۔ اگر ایسے پاگل ہر گھر میں دو چار پیدا

ہو جائیں تو زندگی کتنی ہلکی پھلکی ہو جائے۔

"اے بوا ذرا ادھر آؤ۔" اماں نے مطلب کی بات کہنے کے لیے انھیں پھسلایا۔ شاید میاں سے خفا تھیں، اس لئے اماں نے جب حکیم جی سے علاج کروانے کی تجویز پیش کی تو بدکیں نہیں۔ ایسا لگا غور سے سن رہی ہیں۔

"ارے اب کا علاج کرا دیں۔ او کمبخت ہمکا روگ ایسا لگائے دہس ہے کہ ہم کا کھتم کر دیہے۔ بات بات پر کر کر کرت ہے۔ ہمرے اوپر دھونس جمادت ہے۔ کھونٹی پر سے ڈھول اتار کر بڑے تاسف سے دیکھتی رہیں" ای چرھیا مال جادی کا ہیجہ سمیٹے چھنال، سب کاٹ ڈارس۔" جب ڈھول سے ناامید ہو گئیں تو ویسے ہی بالے میاں سے لڑنے لگیں۔

سیّاں تورے نکھرے ہم ناہیں سہیں گے۔
ارے تم چڑھیو گھوڑا ہم ہاتھی چڑھیں گے
بلما تورے نکھرے......

خوب خوب سیّاں کو کھدیڑا وہ کوٹھا چڑھے تو یہ پہاڑ چڑھیں۔ وہ اُن کی ریس میں پہاڑ چڑھے تو یہ پاتال چڑھیں۔ غرض بیچارے کو چیں بلوا دی۔

"ارے دیکھت جاؤ آپ ہی جھک مار کے ہمرے پیر پکڑیہئے۔"

انہوں نے بڑے اطمینان اور وثوق سے کہا۔

دیوانے بھی اپنی دنیا کے شہنشاہ ہوتے ہیں معاذ اللہ کیا غرور تھا بوا کو اپنے تئیں یہ بادشاہوں کے شاہ اُن کے قدم لیتے تھے۔ اُن کی ایک مسکراہٹ پر مٹے دھرے تھے۔ ایسا مرکز کا چاہنے والا مل جائے تو ہوش وخرد کی دنیا کو کیوں نہ لات مار دے انسان ــــ؟

پنجرے میں بند پرندے، فضا میں اڑانے والی آزاد چڑیوں کی اڑان دیکھکر

تیلیوں سے سر پھوڑتے ہیں۔ جب نہیں نکل پاتے تو انھیں پھنسانے کے لئے شکاری سے ساز باز کرتے ہیں۔ پرندوں کو پھانسنے کے لئے پالتو یا پر کٹے پرند استعمال کئے جاتے ہیں۔

گھر کی چہار دیواری میں دنیا اور سماج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی بھلی بیویوں کو بھی بوا کی یہ آزادی شاق گزرتی تھی۔ عورت ہو کر وہ مرد کے حقوق دابے بیٹھی تھیں جو سب کو کھلتا تھا۔ بوا نے دوا پینے کی حامی تو نہ بھری مگر ہائے توبہ بھی نہ مچائی۔ اماں نے کہا موئی کی "ہاں" اور "نا" کی پہلی چلائی۔ اس کے فائدے کے لئے علاج ہو رہا ہے۔

رات بھر بے قلعی پتیلے میں املتاس کی پھلیاں، ہڑ بہیڑا آملا اور بھی اسی قبیلے کی مکروہ دوائیں اونٹائی گئیں۔ نانی بیوی نے تہجد کی نماز کے بعد آنچ پھر تیز کر دی بوا کو پھسلا کر روک لیا گیا تھا۔ صبح سویرے نہار منھ خوراک پینی تھی۔ ہم لوگ بھی جاگ گئے۔ سارا گھر املتاس کی ہیک سے سڑ رہا تھا۔ گھلے ہوئے گوبر کے رنگ کی بڑا بادیہ بھر کے، دیکھ کے آنتیں حلق کی طرف اچھلنے لگیں۔

بوا نے بہت رسیاں تڑائیں مگر اماں نے اپنی جان کی قسمیں دیں نانی بیوی نے "میاں" کا واسطہ دیا۔ انھیں پکڑ کے موری کے پاس اکڑوں بٹھایا گیا۔

"ڈوپٹے سے ناک پکڑ لو!" دادی اماں نے رائے دی۔ سارا گھر ٹھٹ لگا کے جمع ہو گیا۔ جیسے مینڈھوں کی لڑائی ہو رہی ہو۔ بوا نے ناک دوپٹے سے دابی اور تائی اماں کی مدد سے بادیہ سنبھالا۔

"نہ پلاؤ — اماں بی — ہے ہے آپا بیگم رہنے دو موئی کو" ایکدم قدسیہ خالہ سب کے ہاتھ جوڑنے لگیں۔ "اچھی تائی اماں —"

وہ یہ جلاب جھیلے ہوئے تھیں۔

"اے ہے لڑکی دماغ خراب ہوا ہے تیرا۔ ۔ ۔ " ہم سب ناکیں دبائے موری کے پاس اکڑوں بیٹھے خی خی کر رہے تھے۔

"نہیں تائی اماں۔ ابھی نہ پلاؤ ــــ میں پی چکی ہوں اللہ بچائے۔"

"پی چکی ہو اسی لئے تو آپے میں ہو ذرا۔ نہیں تو بنو اب تک تو تنکے چننے لگتیں۔"

بڑے اہتمام سے بُو انے ایک گھونٹ منہ میں لیا اور پھر سے تائی اماں کی چھاتی پہ کلی کردی۔ بادیہ موری میں پٹخ وہ بھاگیں نلکہ کے پاس مارکُلیاں کرتے کرتے اُتو ہوگئیں۔

موت اوسے اسی حرامی بید کا۔ ہمکا اپنی مہتاری کیر کلیجو پیٔ کا دسے دہس۔" وہ ہر کُلی پر قبلہ حکیم صاحب کو ایک وزنی سی گالی دیتیں۔

"اوکی قبر ماں کیڑے پڑیں۔"

"اے ہے ــــ اتنی قیمتی دوا موری میں لنڈھا دی۔ نہ پینی تھی تو منہ سے پھوٹتیں۔ قدسیہ کے کام آجاتی۔" قدسیہ خالہ لرز اُٹھیں۔

"ارے ہم کہاں پھینکا او ہاتھ مار دیہیس!" وہ الزام بالے میاں پر تھوپ کر الائچیاں چبانے لگیں۔

"اُن سے لڑائی تھی" تائی اماں جل کے رہ گئیں۔

ارے او ایک بدماس ہے۔ اوسے کون لڑائی کرے۔ رات کا ہمرے پیچھے پڑ گوا۔ ہمرے پیر پکڑ لیٔے رو ئے لگا۔"

معاذ اللہ!۔

سب کلس کے رہ گئے۔ بوا نہایت بے تعلقی سے اٹھیں اور چل دیں۔

"اے بو کہاں چل دیں۔ سُنو۔"

"ہمکا جاڑ کے کاٹری۔ بھی کھپا ہوئی جیسے۔" وہ پیار سے انھیں دیکھتیں ہوئی چل دیں۔

"سیاں توری گودی کی پھول گیندا بن جاؤں گی۔" سخت ملاپ ہو گیا۔ شہر میں تھیٹر آیا ہوا تھا۔ سب تڑپ رہے تھے، وہ مزے سے بلا ٹکٹ روز جاتیں۔ وہاں سے نئے نئے گیت اڑا کر لاتیں۔ عشق و محبت کے سلگتے ہوئے دعوے۔ قدسیہ خالہ کے طور بھی بدلے ہوئے آرہے تھے۔ اب وہ راشدالخیری کی "صبح غم" اور "شام زندگی" پڑھ کر ہچکی باندھنے کے بجائے مثنوی زہر عشق چھپا کر پڑھا کرتیں اور راتوں کو صحن میں گھنٹوں ٹہلا کرتیں۔

"قبلہ وہ مردار جلاب ہرگز نہیں پیے گی۔" اماں نے قبلہ حکیم صاحب سے شکایت کی۔

کوئی مضائقہ نہیں۔ میرے پاس بحمداللہ اور ادویات ہیں۔ ایسی کہ اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے۔ یہ تین گولیاں پان میں یا مٹھائی میں رکھ کر دے دیجیے تین تین دن کے وقفہ سے انشاءاللہ مکمل افاقہ ہو جائے گا۔

"لو بوا پان کھاؤ۔" آتے ہی اماں بھاری کھرکا کر مصر ہو جاتیں۔

"ناہیں بھائی ہمرا منھ بکائے جات ہے۔" وہ صاف کترا جاتیں۔

مگر بیویوں کو سوائے بھٹے میں ٹانگ اڑانے کے اور کوئی کام ہی نہ ہو تو کوئی کہاں تک بچ سکتا تھا۔ شائد بالے میاں سے کچھ ان بن ہو گئی تھی یا ان سے غفلت ہو گئی۔ بوا کے حلق سے پہلی خوراک اتار دی گئی اور لوگ اثر ہونے کے انتظار میں بیٹھ گئے مگر بوا کو کچھ نہ ہوا۔ اتنا ضرور فرق ہوا کہ ہم نے انھیں کبھی اس دن سے پہلے سوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نیم کے نیچے کھاٹ ڈالے لیٹی تھیں اور سو گئیں۔ سب کو یقین آگیا کہ ضرور بالے میاں نے کوئی تکرم کی ہو گی کہ گولی بھُس ہو گئی۔ یا شائد نہار منھ نہیں دی گئی اس لیے اثر نہ ہوا۔ بوا ایکدم ہڑبڑا کے اٹھیں اس دن سے پہلے اُن کے چہرے پر ایک عجیب سا انجانا خوف کبھی نہ دیکھا تھا۔ واقعی وہ غیب داں تھیں۔ کچھ غصہ میں اٹھ کر چلی گئیں۔

"اے ہے بھئی خاک ڈالو موئے علاج پر کہیں کوئی اُلٹی سیدھی بددعا لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پہنچے ہوئے لوگوں سے اُلجھنا ٹھیک نہیں" اماں نے فیصلہ کیا۔

"حیرت کا مقام ہے کہ موئی کُٹس سے مس نہ ہوئی" نانی بیوی نے مان لیا۔

مگر شام کو حیرت کے مقام ڈھے پڑے۔ بوا کی حیاارن بھاگی آئی کہ بوا کو صبح سے دست لگے ہوئے ہیں۔ اب اُلٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں اماں نے بوکھلا کر قبلہ حکیم صاحب کے پاس آدمی دوڑایا۔

گرمی نکل رہی ہے!" قبلہ حکیم صاحب نے فرمایا اور کوئی عرق دیا جس سے گرمی نکلنے میں ذرا کمی ہوئی مگر بھینسوں بخار چڑھ گیا۔

کئی دن اماں بلاتی رہیں مگر وہ نہ آئیں۔ وہ پہلے ہی کیا بہت کھاتی تھیں۔ حیارن آکر اُن کے لئے پتلی کھچڑی یا ساگو دانہ لے جاتی مگر وہ ہاتھ بھی نہ لگاتیں بس پانی پیے جاتیں تھیں ــــ

ہفتوں بعد آئیں تو ہمیں ایسا لگا وہ ہم سے ذرا دور ہو گئی تھیں۔ جیسے ہم تو بچے ہی رہ گئے اور وہ سیانی ہو گئیں۔ ہم اُن کے گلے میں جھولے تو تیورا کر بیٹھ گئیں۔

"ای کا مسکری کرت ہو" وہ ترش روئی سے بولیں گویا اس سے پہلے ہم اُن کے گلے کا ہار کبھی نہ بنتے تھے۔ اُن کے کپڑے بھی مسلے ہوئے تھے۔ بال خشک اور الجھے ہوئے پہلے ہی دبلی پتلی تھیں۔ اب اس جھٹکے میں اور بھی گئی گزری ہو گئیں۔ ہم لوگوں نے اُن سے ڈھول مڑھوا دینے کی فرمائش کی تو ٹال گئیں۔ اماں نے اُن کے آگے مٹر کی پھلیوں کی سینی سرکا دی بیٹھی چھیلتی رہیں۔

نانی بیوی اور اماں میں اوپر ہی اوپر اشاروں میں باتیں ہوئیں دونوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ اگر باقی کی دو گولیاں اور پہنچ گئیں تو مرض کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔

"کھو لو آمیاں سے تو اَن بن نہیں"، اماں نے ٹٹولا۔

"کوئی ہم جھگڑا کرت ہیں؟" اس کا مطلب جھگڑا چل رہا تھا۔"او نہ چلنے اپنے کو کا سمجھت ہے۔ بڑا آوا لاٹ صاب کیر بچّہ!"

وہ جز بز ہو گئیں۔ ناچاقی ضرور ہو گئی تھی۔

اُن کی چمارن کہیں پاس کے گاؤں میں زچگی کرانے گئی ہوئی تھی۔ ویسے تو رسّیاں بٹا کرتی تھی۔ سائڈ بزنس کے طور پر ضرورت مندوں کی حاجت پوری کر دیتی۔ اماں نے روک لیا کہ رات یہیں رہ جاؤ۔

اماں حلف اٹھانے کو تیار تھیں کہ حاشا انہوں نے دوسری خوراک نہیں دی۔ مگر دادی کہے جا رہی تھیں کہ بہو اور سمدھن میں مسکوٹ ہو رہی تھی۔ ضرور دوا دی گئی جو کہ نیز ابی بم ثابت ہوئی۔ مارے اجابتوں کے بُوا ڈھیر ہو گئیں۔ رات کو تو ایسی لے دے پڑی کہ ابا تک بات پہنچ گئی۔ ڈاکٹر آیا۔ اُس نے دوا دی مگر وہ صبح تک ہلکان ہوتی رہیں ابا خوب گرجے کہ حکیم صاحب قبلہ کی خوب جوتے کاری ہونا چاہیئے۔ بالکل چوپٹ ہیں۔ اور اگر آئندہ کسی کو دوا دی تو ہتھکڑیاں ڈال دی جائیں گی۔

دادی اماں کو کچھ اس کارِ خیر میں دلچسپی نہیں لینے دی گئی تھی۔ نانی بیوی کا کیس تھا اور وہ خود مورچے پر رہنا چاہتی تھیں۔

"اے بیو لوں کیا ہو رہا ہے۔" دادی بھری بھنڈ تھیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ جملہ دہراتی تھیں۔

"کچھ نہیں بہن ہوتا کیا — تمہارا سر"! نانی بیوی جملہ کا پہلا ٹکڑا زور سے اور آخری نہایت چپکے سے ادا کرتیں۔

"ہمیں تو کبھی کوئی کچھ بتائے ہی نہیں ہے"! دادی اماں بسورتیں دونوں میں ہمیشہ چلتی ہی رہتی تھی۔ سمدھنیں بھی تھیں اور رشتہ میں نندبھاوجیں

بھی لگتی تھیں، مگر اصل نفاق کی بنیاد دونوں کے عقائد تھے۔ نانی بیوی پکی سُنّت جماعت
اور دادی اماں شیعہ۔ دونوں کی چھاؤنیاں مختلف برآمدوں میں تھیں۔ نانی بیوی کے برآمدے
میں صبح سے اماں آکے بیٹھ جاتیں۔ اماں وہ محور تھیں جن کے گرد گھر کی دنیا گھومتی تھی
ظاہر ہے اُن کے برآمدے کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی۔ اماں دادی اماں کو سلام
کر کے اِدھر ہی آ بیٹھتیں۔ قدسیہ خالہ کے کمرے کا دروازہ ان کے برآمدے میں ہی تھا۔
قدسیہ خالہ جو خاندان کا نہایت اہم اخلاقی مسئلہ تھیں۔ اُن کے دوروں سے خوب چہل
پہل تھی۔ پھر شبیر ماموں بھی اِدھر ہی آ کے بیٹھتے تھے اور بچے تو وہیں ہونگے جہاں غل
غپاڑہ ہو۔ دادی اماں کلستی تھیں۔ ددھیال کے ناطہ بچّوں کو شیعہ ہونا چاہیئے تھا مگر
نانی کا سکہ چلتا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سُنّت جماعت کا پرچار کرتیں۔ اماں کی پشتی حاصل
تھی۔ وہ دادی اماں کا کہنا نہ ماننے پر مسکرا کر ڈانٹتیں اور ہم شیر ہو جاتے مگر نانی بیوی
کا کہنا نہ سُنو تو ہڈیاں توڑنے کے وعدے کیئے جاتے۔

دونوں طرف سے ہمیں صراطِ مستقیم دکھا کر جنت میں لے جانے کی کوششیں ہوتیں
ایک کلمہ دادی اماں سکھاتیں تو نانی اماں سنت جماعت کا کلمہ سکھاتیں۔ گڑبڑا کر ہم
دونوں کی کھچڑی بنا دیتے اور قبلہ حکیم صاحب کی تیر بہدف گولیوں کا سا اثر ہوتا۔ ذہنی
جلاب والی کیفیت تھی۔ بہشت کے دروازے کی چابیاں خلط ملط ہو جاتیں اور دونوں
طرف سے کفر کے فتوے ملنے لگتے۔ نانی بیوی دادی اماں کی مجلسوں کی چوٹ پر میلاد شریف
کرتیں۔ مٹی کے سکوروں میں نکتیاں ملتیں۔ ہم فوراً کر سُنّی ہو جاتے مگر جب دادی اماں
کے برآمدے میں جھاڑ فانوس پر سے تھیلیاں اتاری جاتیں اور خضری رکھی جاتی تو
ہم قطعی اُن کے ہو رہتے۔ جب لرزتی آوازوں میں نوحے پڑھے جاتے تو ہم کالے کُرتے
پہن کر خوب ماتم کرتے۔ نانی بیوی دھموکے لگاتیں اور رنگ برنگا کٹ کاٹ کے پھسلانا
چاہتیں۔ مگر محرم شریف کے مہینہ میں دادی اماں کی پارٹی میں رہنا زیادہ مفید ثابت

ہوتا تھا۔ ہمارے لئے ادھر ہی جنت کے دروازے کھل جاتے جدھر تر مال زیادہ ہوتے
"کیوں ری تو سنی ہے کہ شیعہ" دادی اماں عموماً پوچھا کرتیں۔
"شیعہ!" ہم مستعدی سے جواب دیتے۔
"اری دادھنی ہے کہ سنت جماعت" نانی بیوی بھی گا مٹھائی بانٹنے سے پہلے
پوچھتیں۔ شکر ہے دونوں کے کیمپ دور دور تھے اور دونوں کچھ اونچا سنتی تھیں۔
تو کے علاج کا سوال کافی تلخ صورت اختیار کر گیا۔ دادی اماں نے آبا کے کان
بھرے۔ انہوں نے کچھ کہہ دیا اس پر اماں خوب روئیں۔
آبا کی پنشن کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ خوشحالی کے زمانے میں دل وسیع ہو جاتے
ہیں۔ اپنوں پر پیار آنے لگتا ہے۔ کال پڑنے پر محبت کے سوتے بھی سوکھ جاتے ہیں ساری
عمر اللے تللے خرچ کیا۔ اب چند سال میں اس فضول خرچ کا انتقام لینے کی فکر پڑی۔ کوا
بولتا تو دم نکل جاتا۔ اب آنے والا ہے کوئی مہمان۔ ہمارے گھر روز ہی کوا بولا کرتا۔ کبھی ددھیال
والے چلے آ رہے ہیں تو پلڑا برابر کرنے کے لئے ننھیال والے کیوں چوکتے۔ پھوپیاں چچیاں
تائیاں مع شوہروں اور بچوں کے آتیں تو ماموں، خالائیں بھی کنبے لے کر آ جاتیں مہمان
دو مورچوں میں بٹ جاتے۔ دو دستر خوان لگتے۔ جاسوس چھوڑے جاتے۔ دیکھ کر
اطلاع دیں کہ مخالف پارٹی کے ساتھ تر بتر رعایتیں تو نہیں ہو رہی ہیں۔ عموماً ننھیال
پارٹی زیادہ بھاری پڑتی تھی کیونکہ اماں اُن کے کیمپ میں ہوتیں۔ آبا کو پارٹی پالیٹکس
میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ کماتے تھے اماں خرچ کرتی تھیں۔ بالکل
وہی پوزیشن تھی جو آجکل امریکہ کی ہے۔ اُن کے سب ہی مسکا لگاتے تھے۔ خواہ کسی
پارٹی سے تعلق ہو۔ آبا تو نیوٹرل تھے دونوں کا مان کرتے۔
صرف چچا میاں تھے جو دونوں پارٹیوں میں لڑائی کروانے کی تاک میں رہتے۔
اماں جان کے ددھیال والوں کی زیادہ خاطر کرتیں مگر ایسے کہ صاف غیریت کی بو

آتی۔ اگر کوئی کھانا کم ہوتا تو بہ آوازِ بلند اس کا اعلان کرتیں۔

" اُدھر بھجوا دو ہم لوگ تو چٹنی اچار سے بھی کھا لیں گے "

مگر چچا میاں نمبر ایک کا میاں وہ ننھیال پارٹی کے ساتھ کھانا کھاتے مع اس نایاب کھانے کے جو کم پڑ گیا ہوتا پھر جا کر ددھیال پارٹی کے سامنے کہتے۔

"بھئی آج کلیجی گردے لاجواب پکے تھے" "کلیجی گردے بالکل نہیں پکے تھے ہائے ہے کتنے دنوں سے جی کر رہا ہے ذرا سے ادھر نہ بھیجے سب اُدھر ہی زہر مار کر لیئے۔"

پھر دوسرے دن جب کچہری سے لوٹ کر آبا انھیں سلام کرنے جاتے تو وہ فوراً کلیجی گردے کی شکایت کرتیں۔ آبا اماں سے کہتے۔

"بھئی کلیجی گردے اُدھر کیوں نہ بھجوا لیئے۔؟"

"لو اور سنو اے کلیجی گردے کب پکے تھے؟ اماں بگڑ کھڑی ہوتیں۔

"اے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کریدن ڈونگا بھر کے لے گئی" چچا میاں کا بھروسہ کر کے دادی اماں قسم کھاتیں۔ خوب حلف اٹھتے ایمان بیچ میں گھسیٹے جاتے۔ پھر چچا میاں کو بلایا جاتا۔ وہ معصوم صورت بنا لیتے" کیسے کلیجی گردے! بھئی کتنی بار کہا کہ چاولوں کے ساتھ تربوز نہیں ہونا چاہیئے میرے گردے میں بیکلی ہو رہی ہے درد شروع ہو گیا تو ...... چچا بات پلٹتے۔

" ادھر کلیجی گردے کھائے تم نے؟ " تائی اماں ڈٹ جاتیں۔

"کب؟" "بھئی ہمیں نہیں ملے۔ یہ زیادتی ہے۔ تر مال پکتے ہیں اور لوگ ڈکار جاتے ہیں۔" کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا جھگڑا ہے۔ ایک دوسرے کی گواہیاں دلواتا۔ پھر کوئی دکھی دل رو پڑتا۔ ادھر سے جواب میں کوئی شروع ہو جاتا۔ پرانے زخم تازہ کیئے جاتے

"میں نے ذرا چوہے دتیاں منگوائیں تو صاف ٹال گئیں۔"

"وہ زور کا طمانچہ مارا نگوڑے کو کہ پورا پنجہ اتر آیا۔"
"اے بہن اپنوں کی بات اور ہے ...."
"ہاں بھئی ہم تو دشمن ہیں۔"
جب خوب سب ہلکان ہو جاتے تو چچا میاں سب کو ڈانٹتے "کیا کنجڑوں قصائیوں کی طرح لڑا جا رہا ہے۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے۔
..... واللہ بوٹی بوٹی پر کتوں کی طرح لڑائی ہوتی ہے۔"
اُن کے ڈانٹنے پر سب تھکے ہارے نادم ہو کر سو جاتے۔ ددھیال والے خوش تھے کہ ننھیال پارٹی پر بوا کے بارے میں جوتے پڑے۔ بوا بہت بیمار پڑیں۔ تیسری خوراک کی نوبت ہی نہ آئی۔ دوسری خوراک نے انھیں کوئی کام کا نہ رکھا۔ اگر قیس کو قبلہ حکیم صاحب کی تین خوراکیں دے دی جاتیں تو یقیناً وہ مجنوں نہ بننے پاتا۔ نہ اُس میں صحرا نوردی کا دم رہتا نہ لیلیٰ لیلیٰ پکارنے کی کلیجہ میں طاقت رہ جاتی۔ حضرتِ عشق کی چوکڑی بھول جاتے۔
بخار اترنے کے بعد بھی کئی دن بوا منہ سے ملے نقاہت کے بات نہ نکلتی تھی۔ کیونکہ دوسری خوراک فی البدیہہ کارگر ثابت ہوئی تھی اس لئے وہ ہمارے ہاں ہی تھیں۔ وہ دن رات خاموش آنکھیں موندے پڑی رہتیں۔ گئے حواس واپس لوٹ آئے تھے اور کافی سمجھدار ہو گئی تھیں۔ اُن کی تیمار داری جا کے بیٹھ رہی تھی۔ اماں اُن کے بے انتہا لاڈ کرتیں۔ اپنے ہاتھ سے شوربہ بنا کر دیتیں۔ مگر وہ منہ بنائے پڑی رہتیں۔ بڑی خوشامدوں سے دو چار گھونٹ پی لیتیں، تو یا تو الٹی ہو جاتی یا پھر بیت الخلاء کے پاس کھاٹ پڑ جاتا۔ اُن کا معدہ مستقل خراب رہنے لگا۔ بغیر دوا کے ہی گرمی نکلا کرتی۔
"کہاں چلی گئیں بوا؟" "ہم کبھی کبھی سوچتے۔" وہ اکڑتی ہوئی منزدر بوا۔ بچوں کے ساتھ جامنیں جھاڑتی کھیتوں سے خربوزے اور ککڑیاں چراتی ہماری پاگل بوا۔ اللہ نے انھیں عقل کیوں واپس دے دی۔ وہ ہنسنا بھی بھول گئیں۔

اور گانا؟ دوسری خوراک کے بعد اُن کا گلا بیٹھ گیا۔

اللہ اب وہ کبھی نیم کے پیڑ میں جھولا ڈال کر ساون اور کجریاں نہیں گائیں گی؟

اماں ان کی مختار عام بن بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ان کا مکان کرائے پر اٹھا دیا اور بُوا مستقل ہمارے یہاں رہنے لگیں۔ جمارن واپس لوٹی تو ماتم کرتی بُوا کے پاس آئی بُوا کی صحت نسبتاً اچھی تھی۔ بیٹھی بھرتے کے لئے اُبلے ہوئے آلو چھیل رہی تھیں سردیاں شروع ہو گئی تھیں اس لئے زیادہ تر وہ باورچی خانہ میں ہی بیٹھی رہتیں۔ ایک زمانہ تھا جب کڑاکڑاتے جاڑوں میں بُوا ایک ہلکی سی دوہرا اوڑھے راتوں کو گھومتی پھرتی تھیں۔ مگر جب تو ان میں گرمی تھی۔ اماں نے جمارن کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ بُوا چپ گردن موڑے بیٹھی رہیں۔ مکان کا کرایہ جمع کر کے اماں نے بُوا کے لئے کپڑے بننے کو دیئے تھے۔ جب کپڑے بن کر آئے تو بُوا نے سونے کے شیروں کے منھ والے کڑے الٹ پلٹ کر دیکھے اور واپس دے دیئے۔

"اے ہاتھ میں ڈال کے تو دیکھو" نانی بیوی نے زور دیا۔

"ناہیں بھائی۔ کڑے پہننے کا کون موکا ہے" وہ ترشی سے بولیں۔ اب تو بُوا موقع محل بھی پہچاننے لگی تھیں۔

"دیکھو، کون کہے گا کہ یہ نگوڑی پاگل تھی۔ کیسا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے مزاج میں!" نانی بیوی ان کے مرگھلے پن کو ٹھہراؤ کہتی تھیں۔

بالے میاں کا کبھی ذکر بھی نہیں کرتیں۔ ہم کبھی پوچھتے "بوا میاں کیسے ہیں" تو وہ ایسے اجنبی بن جاتیں جیسے وہ ان کے کبھی کوئی نہ تھے۔ انھیں پہچانتی تک نہیں۔ ہم اور چھیڑتے۔

"ہمرا بھیج نہ کھاؤ" وہ جھلا کر کہتیں اور اماں ہمیں ڈانٹ کر بھگا دیتیں۔

"اے ہے اسے یاد نہ دلاؤ موئی کو۔ پھر بورا جائے گی" نانی بیوی ڈانٹتیں۔ مگر خود شرارت سے چھیڑتیں۔

"اے جان پڑتا ہے تمہارے غازی میاں تمھیں بھول گئے!"

بوا جیسے بہری ہوں گم بیٹھیں رہتیں۔

صرف ایک دن ذرا اُن کی طبیعت چونچال تھی۔ بد پرہیزی نہ کریں تو سب کھانا ہضم ہو جاتا تھا۔ اب وہ گھر کا کام کافی سنبھال چکی تھیں۔ ہلکے پھلکے کام سے اب وہ ہانڈی بھی بگھارنے لگیں۔ پانچ سیر دو وقت آٹا گوندھتیں۔ پھر روٹیاں بھی ڈالنے لگیں۔

"اُدتو ہر جائے ہے!" بوا نے ذرا تنک کے کہا۔ ذرا جوش میں آگئیں۔ نہا کر بیٹھی بال سکھا رہی تھیں۔ کچھ کچھ پرانی بوا سی لگ رہی تھیں۔ ایکدم مری سی آواز میں گانے لگیں۔

ہو راجہ جی۔ سوتن کے لمبے لمبے کیس

الجھ مت رہنا۔ ہو راجہ جی۔

اُن کے لہجے کا وہ دثوق غائب تھا۔ بالے میاں اُن سے بیوفائی کر گئے تھے۔ یا کرنے جا رہے تھے۔ انھیں اپنے چھدرائے ہوئے بال دیکھ کر سوتن کے لمبے کیسوں سے ڈر لگ رہا تھا۔

"ہو راجہ جی..... سوتن کے گورے گورے گال" بوا کا سانولا سلونا رنگ مٹیالا اور گدلا ہو گیا تھا۔ یکایک بوڑھوں کی طرح جھک کر رہ گئی تھیں۔ اٹھتیں تو گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ تڑک بھڑک ایک سرے سے غائب ہو گئی تھی۔ بالے میاں کا پیار تج کر وہ لنڈ منڈ اور اُجاڑ ہو کر رہ گئیں۔

بچپن کسی کا ماتم نہیں کرتا۔ انھیں گھٹتا چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے۔ قدسیہ خالہ پہلے سے بہت بدل گئی تھیں۔ بجائے ہر وقت ہم لوگوں کی چیخ پکار کی شکایت کرنے کے وہ ہمیں خود بلا کر ہمارے جھگڑے چکاتیں، سبق یاد کرواتیں۔ سردی سے پھٹے ہوئے ہاتھ پیر مانجھ کر ویسلین لگاتیں۔ یا تو کبھی وہ ادھ موئی لیسوری پڑی رہا کرتی تھیں۔ کئی کئی

دن کنگھی نہ کرتیں، کپڑے چیکٹ ہو جاتے، بدلنے کا خیال نہ آتا۔ جس کا دیکھنے والا ہی آنکھیں پھیرے تو وہ سہاگن پھر کس کے لئے سنگھار کرے۔ سہاگ کی مروّت میں دو درد کانچ کی چوڑیاں ضرور ڈالے رہتی تھیں۔ لوگ اُن کے صبر اور وفا کے محفلوں میں قصے سُنا سُنا کر جھُوما کرتے تھے۔

مگر ایکدم ان میں بڑی نرم و نازک سی تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ آنکھیں بند کئے لیٹے رہنے کے بجائے وہ گھنٹوں چہل قدمی کرتیں۔ رنگ بھی کچھ نکھر آیا۔ شائد اس اُبٹن کا اثر ہو جو انہوں نے قسم قسم کے مسالحے کوٹ چھان کر تیار کیا تھا۔ نانی بیوی کبھی اُن کی چوٹی کرتیں تو بھر بھر مٹھی بالوں کے اترا کرتے تھے۔ جب سے انہوں نے سیکا کائی میں بال چھڑ، چھیل چھبیلا اور ناگر موتھا ملا کر سر دھونا شروع کیا تھا واقعی بال چمکدار اور ملائم ہو گئے تھے یا شائد ہمیں اس لئے اب ان کی سب چیزیں اچھی لگتی تھیں کہ وہ ہمیں خُدا کی لعنت کی بجائے شریر بچے سمجھنے لگی تھیں۔ پہلے وہ سہاگ کا مان رکھنے کے لئے ڈوپٹہ کسی بھی اودے پیلے رنگ میں ڈبو کر الگنی پہ سکھا لیا کرتی تھیں۔ اب جب سے آگرہ سے چھبیس کی ململ کا تھان منگوایا تھا نہایت صوفیانہ رنگوں کے ڈوپٹے رنگے جاتے۔ بالکل موسم کے حساب سے جوڑے بنا کر لچکا ٹانکا جاتا۔ محرم کے لئے سبز، ساون کے لئے لہرئے دار پچ رنگے ڈوپٹے رنگے جاتے۔ ہم بڑی خوشی سے اُن کے لئے لوٹوں میں پانی بھر بھر کے لاتے۔ اُن کے افشاں لگے ڈوپٹے دھوپ میں اُلار اُلار کر سکھواتے اور ڈھیروں ادھ کھلی کلیاں لا کر اُن کے تکیہ پر ڈھیر کر دیتے۔ اُن کی بالیوں میں کلیاں پرو کے گیلے کپڑے میں لپیٹ کر صراحیوں کے پاس رکھ دیتے۔ شام کو وہ نہا دھو کر دھیمے دھیمے رنگ کے کرکرے غرارے اور چکن کی قمیص پر چنے ہوئے ڈوپٹے اوڑھتیں پھول بھری بالیاں پہنتیں اور خلا میں دیکھ کے ایسے مسکراتیں جیسے اُن کے بھی کوئی غازی میاں کھڑے اُن سے چھیڑ خانی کر رہے ہوں۔

اُن کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ کر گھر کی ذمہ دار خواتین کچھ متفکر رہنے

لگی تھیں۔ خالہ کو دورے پڑتے تھے وہ تو برحق تھے۔ ہر بدنصیب میاں کی ٹھکرائی عورت کا یہی مشغلہ ہوا کرتا ہے۔ مگر سولہ سنگھار کر کے ہار پھول پہننا اس عورت کو زیب نہیں دیتا جس کا خدائے مجازی اس سے روٹھ چکا ہو۔ اب تو بس اللہ کا شکر کر کے جو پھٹا پرانا ملے تن ڈھانک لیا جائے اور روکھی سوکھی سے پیٹ کی دوزخ بجھائی جائے۔ دنیا دیکھے گی۔ یہ چوچلے تو کیا کہے گی؟ یقیناً جہنم میں ٹھوکے گی۔

یہ تیل پھلیل، پھول پان دل میں فاسد خیالات کو بھڑکاتے ہیں۔ شیطان کو شہ ملتی ہے۔

"اے قدسیہ تیرا جی کچھ بھاری ہو تو حکیم صاحب کو بلوائے لیتی ہوں" نانی بیوی ان کی تندرستی سے خائف ہو کر کہتیں۔

نہیں تو اماں بی۔ اچھی بھلی ہوں! قدسیہ خالہ چوروں کی طرح نظریں بچاتیں۔

"صبح بڑی اینڈتی رہیں۔ فجر کی نماز قضا کر دی!"

"قضا پڑھ لی اماں بی"

"وہی تو میں کہوں ہوں یہ رات رات بھر الم غلم نہ جانے کیا بلا بد تر پڑھتی رہتی ہو۔ فجر کی نماز ملے تو کیسے۔؟"

قدسیہ خالہ آئے دن ناولوں کے وی پی چھڑاتی رہتیں۔ کیا مجال جو کسی کو دکھائیں جیسے ہی کوئی آتا چٹ تکیہ کے نیچے چھپا لیتیں۔

"اُوئی یہ جھمکے کیوں پہنے گئے ہیں" کبھی قدسیہ خالہ ہاتھ گلے میں کوئی زیور ڈال لیتیں تو نانی بیوی کا منھ بکس جاتا۔ نہایت فکرمند ہو کر پوچھتیں۔

"ایسے ہی۔ ہمارا جی کرا" قدسیہ خالہ کانوں میں جھمکے جھلا کر مسکراتیں۔ 1

"اوئی مُواجی نہ ہوا وہ ہو گیا" نانی بیوی بڑبڑاتیں۔ یا تو ہر وقت ماتم کیا کرتی تھیں" ڈنڈا سے ہاتھ کوچے کان لئے پھرتی ـــــ ہائے کن ارمانوں سے بنوائے تھے

زیور۔ نگوڑی کو پہننے بھی نہ نصیب ہوئے۔ اے قدسیہ عید بقرعید تو کچھ پہن لیا کر۔"
"کس کے لئے پہنوں بی اماں ؟" قدسیہ خالہ آہیں بھر کے جواب دیا کرتی تھیں۔ مگر یہ زمانۂ ماضی کی باتیں تھیں، مگر اب ـ؟ نہیں جی آثار بالکل اچھے نہیں تھے۔ یہ رات رات بھر واہی تباہی خاک پڑی کتابیں پڑھنا۔ ٹھنڈی آہیں بھر بھر کے صحن کا فرش ناپنا اور آسمان دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ مسکرانا۔ خاندان پر مرٹنے والی بیٹیوں کے یہ لچھن نہیں ہوا کرتے یہ سوکھے ہوئے ٹھونٹھ میں کونپلیں کیوں پھوٹ رہی تھیں۔

نانی بیوی نے تو اب قدسیہ کے دولہا کا دل پھیر دینے کی دعائیں مانگنا بھی ناغہ کر دی تھیں۔ دولہا تو خاک بھی نہ آئے۔ ہاں شبیر ماموں پابندی سے آتے۔ ہمیں تو ایسا لگتا جیسے بازیگروں کی طرح پیروں میں بانس باندھے ہیں۔

وہ آکر بہت دور بے تعلق ہو کر بیٹھ جاتے۔ قدسیہ خالہ بھی انجان بنی بار بار ڈوپٹہ سنبھال لیتیں۔ وہ اور بھی مچلتا۔ گریبان کے سونے کے بٹن بوجھل ہو کر دھنسنے لگتے۔ اب انھیں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

پھر وہ ہم میں سے کسی کو اکساتیں۔ "شبیر ماموں سے کہو،
"سرکار مدینے والے" سنائیں۔

ہمیں سرکار مدینے والے سے "آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی" زیادہ پسند تھا۔ مگر خالہ کو خوش کرنے کے لئے شبیر ماموں کے پیچھے پڑ جاتے۔

"ادھر بیٹھاؤ مونڈھے پر" وہ شہ دیتیں اور ہم انھیں لاکر مونڈھے پر بٹھا دیتے وہ سنانا شروع کرتے تو ہم بور ہو کر جانا چاہتے۔ مگر خالہ ہمیں پکڑ لیتیں۔ چپکے سے کان میں گاجر کے حلوے اور مونگ کی دال کی پنڈیوں کی رشوت کا حوالہ دے کر وہ ہمیں مجبور کر دیتیں۔ جیسے ان کے دل میں کوئی چور تھا۔ اکیلی اُن کے پاس بیٹھتے ڈرتی تھیں۔ ہم ساتھ ہوتے تو موقع اچھا ملتا تھا۔ دونوں نہ جانے کیا ایک دوسرے سے کہتے اپنے

کچھ پلے نہ پڑتا۔ نہ جانے کس بات پر قدسیہ خالہ ہنسنے لگتیں اور ہنسے جاتیں۔ ہم بھی ساتھ ہنسنے لگتے۔ بچوں کو ہنسنے کے لیے وجہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خالہ کا رنگ نکھر آتا اور پھولوں بھری بالیاں گالوں کو چومتیں۔ سب کو ہنستا دیکھ کر شبیر ماموں کی آنکھوں میں بھی موتی بکھر جاتے۔ بے رونق ہونٹ جاگ پڑتے۔

"خماں خماں ہی کو ہنس رہی ہو پگلی!" وہ اتنے چپکے سے منہ ہی منہ میں کہتے مگر خالہ سن لیتیں۔

"آپ چاہتے ہیں سدا روتی ہی رہوں۔"

"نہیں قدسیہ! میں...... میں تو چاہتا ہوں......" وہ ہکلانے لگتے۔

"کسے چاہتے ہیں؟" قدسیہ خالہ ان کی بات بیچ سے اچک لیتیں اور اپنے مطلب کی بنا لیتیں۔

"قدسیہ......" بڑبڑ ماموں نہ جانے کیا کہتے۔ خاک سمجھ میں نہ آتا ہم احمقوں کی طرح منہ تکتے۔

"بڑبڑ ــــ" قدسیہ خالہ نہ جانے کیا کہتیں اپنی کچھ سمجھ میں نہیں آتا مگر اتنا اندازہ ہو جاتا کہ نہایت میٹھی اور پیاری پیاری باتیں ہو رہی ہوں گی۔ ان کے چہروں کے تاثر سے ہمارے دلوں میں بھی لڈو پھوٹنے لگتے۔ بچے بہت سی ان کہی باتوں کا مطلب سمجھ لیتے ہیں، محسوس کر لیتے ہیں۔ ہم کھلکھلا کر ہنستے انھیں آڑ مل جاتی۔"

"جھوٹے! کھائیے میری جان کی قسم!"

"کوئی اپنی جان کی قسم کیسے کھائے!" وہ اتنے ہولے سے کہتے کہ بہری کھنڈ نانی بیوی خاک نہ سن پاتیں۔ دادی اماں کا مورچہ ذرا پرے کو تھا۔ فریقین میں آجکل زوروں کی چل رہی تھی۔ دادی اماں نے مجلس کی مٹھائی بھجوائی۔

نگوڑی تلنگین ہو گی۔" نانی بیوی کہتی تھیں۔ شیعہ تھوک اور غلاظت ملا دیتے ہیں۔

انہوں نے سب کے سامنے نکتیوں کے لڈو بطخوں کو چگا دیئے۔ دادی اماں خون کے سے گھونٹ پی کے رہ گئیں۔ مگر جب نانی بیوی نے سہارنپور سے آئی ہوئی پارسل میں سے انھیں لوکاٹ بھجوائے تو انہوں نے فوراً مہترانی کو دید یئے۔

"اری بہو دھو لیجیو" انہوں نے نانی اماں کو جلانے کے لئے بآواز بلند مہترانی کو رائے دی۔

بچھڑ جانے قدسیہ خالہ کیا بورتیں فضا مکدّر ہوجاتی۔ خالہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے پر مصر ہوتیں۔ شبیر ماموں مجرموں کی طرح فرش کی اینٹوں کو اس انہماک سے گھورتے جیسے ذرا نظر چوکی تو وہ اچھل کر بھاگنے لگیں گی۔

شام ہوجاتی شبیر ماموں اٹھ کر چلے بھی جاتے مگر خالہ کی آنکھوں میں روشن شمعیں جگمگاتی رہتیں۔ ہونٹ مسکراتے رہتے۔ جیسے کبھی بوا بالے میاں کو دیکھکر آپ ہی آپ بڑے ناز دانداز سے مسکرایا کرتی تھیں۔ جب اُن کی بالے میاں سے ان بن نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب تو بوا کی آنکھیں خالی ہوچکی تھیں، جیسے بنا تیل کے بتیاں دھواں دے رہی ہوں۔ عجب باسی پن چھایا رہتا۔ علاج ہوئے کافی عرصہ ہوچکا تھا مگر معلوم ہوتا تھا حکیم صاحب قبلہ کی گولیاں اُن کے معدہ میں چپک گئی تھیں۔ آئے دن پیٹ خراب رہتا۔ کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں۔ بوا جو کبھی چڑیا کی زبان اور روٹی کا پھپولا کھایا کرتی تھیں۔ اب بھر کبھر رکابی مکئی کا بھات اب ارہر کی دال کھاتیں اور دن بھر کھٹی ڈکاریں لیا کرتیں۔ نیند کا جیسے مرض ہو گیا تھا۔ جب دیکھو جب منہ کھلا ہے کسی چیز کا سہارا لئے چپ چپ سو رہی ہیں۔ جب پاگل تھیں تو نیند نہیں آتی تھی اب تو مزے سے ہر وقت اونگھتی تھیں۔ ہوشیار بھی خاصی ہوگئی تھیں۔ روز کرایہ داروں سے جلکے دنگا کرتیں۔

"حرامجادے کرا وانا ہیں دیت ہیں! ہر کوئی ہم کا لوٹے کی پھکریں رہت

ہے۔" بُوا نے ہوش آتے ہی دیکھا دنیا لٹیروں اور چوروں سے بھری پڑی ہے جیسے اُن کی آنکھوں میں کسی نے جادو کی سلائی پھیر دی ہو۔ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مکان چو رہا ہے۔ مگر مرمت کس سے کرادیں، راج مزدور چور ہوتے ہیں۔ مونڈھے رکھ دیں گے کڑوں کے بعد شیر کے منہ والی ہنسلی بھی گڑھوالی اور فوراً اماں کے پاس لاکر لوہے کے سیف میں رکھوادی۔ پھر بھی اطمینان نہ ہوتا تھا۔ ہر وقت کڑے ہنسلی کی خیریت پوچھتیں۔

"بھائی تالی تو ٹھیک سے رکھی ہے؟"

کہیں آس پاس چوری ہو جاتی تو بُوا پہ قیامت ٹوٹ پڑتی۔ فوراً اماں سے سیف کھلوا کر اطمینان کرتیں۔ ہمیں اب وہ اپنی پیاری بُوا نہیں دوسری بیوقوف عورتوں کی طرح لگتیں۔

پرانے تعلقات بالکل ذہن سے اتر گئے تھے۔ اب انھیں سالہ پیٹنے چولھا جھونکتے دیکھ کر چڑ سی آتی۔ اب تو ہم اُن کے ساتھ سونے کی ضد بھی حماقت سمجھتے تھے۔ ن میں تازہ کھدی مٹی کی سوندھی مہک کے بجائے لہسن پیاز اور باسی کھانوں ، سی سڑاند آتی تھی۔

قدسیہ خالہ اور کھل گئیں۔ نانی بیوی مر گئیں۔ بیر آئیں مگر انہوں نے دوا نہ پی ر کھلے بندوں شبیر ماموں سے میر کا کلام پڑھنے میں مدد لینے لگیں۔ شام ہوتی ھر کی نماز کے بعد جیسے ہی قدسیہ خالہ بائیں طرف سلام پھیرتیں طلسمی دیو کی طرح شبیر اموں صدر دروازہ پر نمودار ہو جاتے۔ وہ سمجھاتے اور خالہ سمجھتیں۔ دونوں کی آنکھیں نکی رہتیں۔ چہرے اجنبی بنے رہتے۔ کبھی لمحہ بھر کو آنکھیں جڑ جاتیں تو ہمارے دلوں ں بے سمجھے بوجھے ہلچل سی مچ جاتی۔ جیسے آسمان پر رنگ برنگی پتنگوں میں پیچ پڑ ے ہوں۔

جب ہم بچے سمجھنے لگے تو نانی بیوی تو ایک خرانٹ تھیں۔ ادھر سے دادی اماں لد

کی معنی خیز ناقدانہ مسکراہٹیں۔

"اے بی کچھ ایسی ویسی ہو جائے تو ناک تو صاحب خانہ کی کٹتی ہے۔" وہ بدبودار پٹھانی سے پیر دبواتے۔ وقت اُسے باریک فلسفہ کے نکات سمجھایا کرتی تھیں۔ بالکل جیسے عام سیاست پر تنقید ہو رہی ہے۔ کسی کی طرف اشارہ ہو تو خدا کی پھٹکار۔

ویسے اگر کہیں پانی مرتا ہو تو وہ کیا کریں!

نانی بیوی سنتیں اور پھڑپھڑاتیں۔

"اللہ ذری املی توڑ دیجیے، چٹنی پسوائیں گے۔؟" قدسیہ خالہ گریبان کے بٹنوں سے کھیل رہی تھیں۔ شبیر ماموں آکے بیٹھے ہی تھے۔

"کاہے سے توڑ دوں؟ کوئی بانس والس!"

"اوئی! ماشاءاللہ آپ کیا کسی بانس سے کم ہیں۔ ذری ہاتھ بڑھا کے توڑ لیجیے ــــ!"

ایک پل کے لیے شبیر ماموں کی آنکھوں میں کوندا سا لپکا۔ ایسا لگا وہ زندہ ہیں، اور اگر آس پاس کوئی نہ ہوتا تو یقیناً وہی حرکت کیا کرتے منجھولی کا منگیتر اُسے اکیلے دوکیلے بھیج کر کیا کرتا تھا۔

کالے دیو نے قدسیہ خالہ کی گردن کاٹ کے سرہانے کی چھڑی پائنتی اور پائنتی کی سرہانے رکھ دی تھی۔ اُن کی گردن سے لعل ٹپک ٹپک کر شبیر ماموں کی جھولی میں گر رہے تھے مگر وہ بے بس تھے۔ کیوں کہ دیو نے جادو کی چھڑی گھما کر انھیں مکھی بنا دیا تھا۔ اگر ان میں اتنی سکت ہوتی اور وہ آگے بڑھ کے پائنتی کی چھڑی سرہانے رکھ دیتے تو قدسیہ خالہ کا کٹا ہوا سر فوراً جڑ جاتا۔

شبیر ماموں کے جانے کے بعد نانی بیوی نے قدسیہ کو اُن کی شوخی پہ پھٹکارا۔

"تو کیا میں نے کوئی چھنالا کرلیا" وہ ایکدم ٹھنکا کے اٹھ بیٹھی۔

"ہے ہے نامراد لوگ کیا کہیں گے۔ مانا کہ شبیر بڑا شریف بچہ ہے۔ غیر نہیں رشتہ میں دیور ہوتا ہے۔ مگر یہ دنیا بڑی تھڑدلی ہے۔

بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی میری بانو۔

"جوتی یہ گواروں اس دنیا کو۔ دس برس سے جوانا مرگ مجھے رُلا رہا ہے اُسے دنیا کچھ نہیں کہتی" "سچ ہے لڑکیوں کو الٹی سلٹی کتابیں نہیں پڑھانا چاہیں۔ زمانہ بھر کا لُبس بھرا ہوتا ہے۔

"بیٹی وہ مرد ذات ہے۔ اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ عورت کی عزت نازک آئینہ ہوتی ہے۔ ایک دفعہ بال پڑ گیا تو ساری عمر کو منہ ٹیڑھا ہی دکھائی دے گا۔

"اونھ!" قدسیہ خالہ لاجواب ہو کر اپنی قمیص سے میچ کرتی چوڑیاں ڈبہ میں سے چھانٹ کر پہننے لگیں۔

"میرے تو گردھر گوپال......دوسرا نہ کوئی......" وہ گنگنانے لگیں۔

"اب تو بیل پھیل گئی، کیا کرے گا کوئی۔"

میرے تو......"

"اے بیٹی تم سے کتنی دفعہ کہا کہ یہ موئے کافرانہ گیت نہ الاپا کرو۔ گناہ ہوتا ہے ظہر کی نماز بھی کھا گئیں۔ کتنا کتنا جگایا مگر پڑی اینڈتی رہیں۔ رت جگے ہوں گے تو دن کو چمگادڑوں کی طرح پڑ کے سوؤ گی"

وہ تنک کر اٹھیں کہ دوپٹہ زمین پر لوٹ گیا اور گریبان کے بٹنوں کے گھنگرو بج اٹھے۔ لوٹا لے کے چوکی پہ وضو کرنے بیٹھ گئیں۔

نانی بیوی کیا سب ہی بھلی بیویوں کو تن تن کے چلنے والی لڑکیوں سے چڑ تھی۔ شریف بچیاں رسان رسان ادب سے چلتی ہیں۔ قدسیہ خالہ کی نئی نئی ابھرتی

دیکھ کر نانی بیوی کو جھٹکے سے لگتے تھے۔
"اے بی یہ کیا چال ہے جیسے تھا کبوتری۔ اگا یا پیچھا یا باہر کو نکلا پڑتا ہے۔"



قدسیہ خالہ کے منہ لگنا اپنی جوتی اپنے سر مارنا ہے۔ انہوں نے اماں سے مسکوٹ کی۔
"یہ شبیر موا جان کے پیچھے اچھا لگا ہے۔ کتنی دفعہ منگھم میں ٹوک چکی ہوں مگر جب تو وہ بھی قدسیہ کی شہ پا کے ڈھٹائی پر تل گیا ہے۔ مجھے تو خلجان ہو جاتا ہے۔"
اے بی تمہیں تو خبط ہو گیا ہے۔ اور کچھ نہیں تو شبیر نگوڑے پہ شک آنے لگے دو گھڑی ذکھیا ہنس بول لیتی ہے۔ جینے کا تو بہانہ چاہیئے۔ اماں اچھے موڈ میں ہوتیں تو نانی بیوی ٹوٹنے لگتیں۔
"اے خاک پڑے ایسے جینے پہ۔ کیا ارادے ہیں؟ تم بھی بہن کے ٹسوئے دیکھ کے پھسل جاؤ ہو۔"
"میں کہوں اگر ایسا ہو جائے تو کیا برائی ہے؟" اماں نے ٹھٹکتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟"
مجھو کہہ رہے تھے انہوں نے ایک اپنے دوست وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں...... " چچا میاں کا نام مستقیم تھا مگر پیار میں مجھو کہلاتے تھے۔ مستقیم کے معنی

ہیں سیدھا، مگر چچا میاں کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ انتہا سے زیادہ اینگے بینگے تھے۔
"آگ لگے خدائی خوار کے منہ میں۔ رنڈیوں کے ٹکڑوں پہ پلنے والا موا بھڑوا"
نانی بیوی نے چچا میاں کی قبر کھود ڈالی۔ جو نہایت زندہ مونڈھے پہ بیٹھے قدسیہ خالہ
سے سر میں تیل لگوا رہے تھے۔
"اے ہے میں کہوں.........." اماں ہکلائیں۔
"خبردار جو تم نے اس معاملہ میں زبان کھولی۔ کیا بہنا کو دوسرا خصم کراؤ گی۔؟"
"اے غارت ہو۔" ہمیں غور سے اس قدر راز کی باتیں سنتے پاکر اماں نے ایک
دھموکا جڑا۔
قدسیہ خالہ ان باتوں سے بے خبر چچا میاں کے کچھ پوچھنے پہ شرما رہی تھیں اُن
کے سفید گال تمتا کر گلابی دوپٹے میں ڈوبے جا رہے تھے کہ ٹاٹ کا پردہ سرکا اور
شبیر ماموں غوطہ مار کے اندر آئے۔ وہ ہر دروازے سے اپنا سر بچانے کے سرنیہوڑا لیا کرتے
تھے۔ فضا ایکدم سانس روک کے تھم گئی۔ اماں نے اپنا بڑے پائنچوں کا پاجامہ تہہ
کر کے کمر میں اڑسا اور رام جھول چھنکاتی چلیں۔ ابا کی ٹم ٹم کی گھنٹی کی آواز دور ہی سے آجاتی
تھی۔ وہ کلب سے لوٹ کر باہری زینے سے اوپر چلے جاتے۔ بالکل میر قافلہ کی طرح وہ
سب سے الگ تھلگ سکون سے اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اماں چھن چھن کرتی اپنا
پنڈ چھڑا کر پتی سیوا کرنے چلی گئیں اور نانی بیوی نے مورچہ سنبھالا۔ چچا میاں بھی عموماً ٹم
ٹم کی گھنٹی سن کے سرک لیا کرتے تھے۔ گمبھیر طبیعت والے بڑے بھائی سے اُن کی روح
فنا ہوتی تھی۔ حتی الامکان کنی کاٹ جاتے کہ کہیں کسی بات کی پوچھ گچھ کے بے طلبی نہ ہو
جائے۔ باتیں وہ ایسی کرتے تھے کہ پوچھ گچھ کے جھمیلے میں نہ پڑنے ہی میں خیر و عافیت تھی۔
شبیر ماموں نے کتابوں کا بنڈل پلنگ پہ رکھتے رکھتے کچھ منہ ہی منہ میں کہا
قدسیہ خالہ نے پھس سے کچھ جواب دیا اور وہ دادی اماں کو سلام کرنے اُن کے برآمدے

میں چلے گئے۔

نانی بیوی اُن کی تاک میں ایسے بیٹھی تھیں جیسے چوہے کے لئے بلّی جیسے ہی وہ برآمدے میں سے غوطہ مار کے نکلے انہوں نے دبوچ لیا۔

قدسیہ خالہ کچھ جھینپی سی ابّا کے لئے کھانا اتروانے باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں۔ کھانے کے خوان چنے جا رہے تھے۔ وہ یہ سوچ کے کہ اماں بی کوئی خوشگوار راز کی باتیں شبیر سے کر رہی ہوں گی آپ ہی آپ گنگنا رہی تھیں۔ ڈھول مڑھ کر آ گیا تھا۔ وہ چوکی پر بیٹھ کے کڑیاں چڑھانے لگیں۔ بوا اکتائی سی دیوار سے لگی بیٹھی ایک طرف کو تھوک رہی تھیں۔ شاید املتاس کے مزے کو تھوکنا چاہتی تھیں۔ ہر وقت جہاں بیٹھتیں تھوک کے جاتیں۔

"اچھی بوا ذری وہ نوٹنکی والے کی کٹگری بتاؤ نا۔ نگوڑا کیسے تھاپ مارتا تھا۔"

بوا نے ایک دفعہ ڈھول کو ایسے دیکھا جیسے پوچھتی ہوں "یہ کیا بلا ہے" پھر منہ پھیر کر تھوک دیا۔

"ہائے بوا تمہیں بالے میاں کی قسم!" انہوں نے ڈھول سرکا کر بوا کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا پھر ایک دم چھوڑ دیا۔

"ہائے بوا تمہیں تو بخار ہے۔" ان کا ماتھا چھوا تو جل رہا تھا۔

کئی دن سے نانی بیوی چلا رہی تھیں کہ بوا نے میرا برآمدہ گھنگا کے رکھ دیا ہے ناک نہیں دی جاتی۔ اے بھئی ان سے کہو اپنے گھر جا کے رہویں۔ کرائے دار تو بھاگ گیا۔ دونوں وقت کھانا یہاں سے پہنچا دیا جائے گا۔" انہوں نے اماں کو چڑھایا۔ اُن کی دلچسپی بھی اب بوا میں ختم ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہو سکتا تھا۔ سب نے ان کی بھلائی کے لئے کیا۔ ابا پنشن کی فکر میں کفایت شعاری پر ہر وقت زور دیتے۔ اس مہمان نوازی نے تو پست کر ڈالا تھا۔ ہر موسم ہر تہوار ہر بہانے سے مہمان آن دھمکتے۔ پُر تکلف کھانے پکتے۔ موسم اور تہوار کے اعتبار

سے جڑاول یا گرمی کے کپڑے بنوائے جاتے۔ مہمان بدہضمی سے بال بال بچ کر تحفے سمیٹ کر رخصت ہوتے تاکہ نئے مہمان کے لئے چارپائیاں خالی کر سکیں۔

بوا کا مستقبل کافی سنوار دیا گیا تھا۔ جی اچھا نہیں رہتا تھا تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ اس میں کسی کا کیا قصور۔ الابلا زہر مار کر بیٹی تھیں۔ اُن کی چارن سے عرصہ ہوا پیچھا چھوٹ چکا تھا۔ وہ ایک دن آئی بھی دیر تک بیٹھی اُن کے پیر دباتی رہی۔ اُن کی درگت پر آنسو بہاتی رہی مگر پھر ڈانٹ کے بھگا دی گئی اور پیپل کے پیڑ کے نیچے رہنے لگی تھی۔ بھیک سے گزر ہو جاتی ہوگی۔

مگر اب مجبوری تھی۔ عرصہ کے موقع پر مجمع اپنے سسرال والوں کے آرہی تھی۔ اُس کی ساس بہو کی گود ہری ہونے کے لئے منت ماننے آنا چاہتی تھیں۔ اس لئے بوا عارضی طور پر اپنے گھر چلی گئیں۔ اُن کی لاڈلی چارن پھر برآمدے میں آکے ڈٹ گئی۔ تین وقت چائے اور کھانا سینی میں لگ کر چلا جاتا۔ جی اچھا ہوتا تو وہ خود آجاتیں کبھی کئی کئی دن پڑی رہتیں۔ نانی بیوی کے برآمدے میں جب سے قلعی ہوئی تھی وہ بہت محتاط ہو گئی تھیں اتنی صاف جگہ اب بوا کو اٹھتے بیٹھتے بھی ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ پہلے آیا کرتی تھیں تو گھر کی بیوی سے زیادہ اجلے کپڑے ہوتے تھے تو ساتھ بیٹھتی تھیں۔ پھر میلی ہونے لگیں تو ان کے آتے ہی سامنے پیڑھی یا پیڑھا سرکا دیا جاتا اور وہ بیٹھ جاتیں۔ پیڑھی نہ ہوتی تو دہلیز پر بیٹھتیں۔ مہترانی، دھوبن اور دوسری نیچ عورتوں کی طرح۔ دادی اماں کسی کا جھوٹ نہیں پالتی تھیں۔ ان کے پاس جاؤ تو جی گھبرانے لگتا تھا۔ ہر وقت "ہوں ہوں" کا نکھتی رہتی تھیں۔ کبھی رات کو جانے کی سکت نہ ہوتی تو بھینس کے چھپر میں آدھی کھٹیا اندر آدھی باہر ڈال کے پڑ رہتیں۔ گوبر اور مرغیوں کی بیٹ کی بدبو میں بوا کی بدبو دب جاتی تھی۔

شبیر ماموں جو اس دن نانی بیوی سے بات کر کے گئے تو جیسے غائب ہی ہو گئے۔ قدسیہ خالہ بورانی ہو کر ٹہلتیں۔ سونے کی تو انہوں نے قسم ہی کھالی۔ جب دیکھو کروٹیں بدل رہی ہیں۔ مارے فکر کے نانی بیوی گھُل جاتی تھیں۔

سنجھلی کا پھر نصیبہ جاگنے والا ہو رہا تھا۔ اُس کی ہونے والی خلیا ساس اور دیورانی بارہ بنکی سے آئی ہوئی تھیں اور خاطر میں وصول کر رہی تھیں۔

"اے انہی کے میاں نے میم ڈال لی ہے"۔ ہونے والی دیورانی نے بڑے تاسف سے پوچھا۔ قدسیہ خالہ عمر میں پہلی بار بجائے فخریہ نڈھال ہونے کے نہایت بھونڈے پن سے ہنسیں...... "ہاں بہن ـــ میم ہے ہماری سوتن! پر سنا ہے تمہارے میاں نے تو تیلن ڈال لی ہے۔؟"

بات درست تھی مگر بلی کے گو کی طرح چھپائی جاتی تھی۔ دیورانی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ وہ چلی گئیں تو پتہ چلا لڑکا ذرا کانا ہے۔ مگر سب کو یقین تھا کہ یہ والی اڑچن سنجھو کی شادی میں قدسیہ نے ڈالی۔ حکیم صاحب قبلہ سے قدسیہ خالہ کی صحت کے بارے میں رجوع کیا گیا تو انہوں نے وہی سوداوی مادّے کی افراط تشخیص کی اور وہی

نامراد املتاس والا نسخہ، خون کی حدت کا واحد علاج!

نانی بیوی نے قدسیہ خالہ کی ایک نہ سنی اور اپنے برآمدے میں اینٹوں کا چولہا جما کے اپنے ہاتھ سے تریاق تیار کیا۔

بیٹی اللہ شافی اللہ کافی کہہ کے پی جاؤ" نانی بیوی نے انھیں بادیہ تھما کر بیٹھ سہلائی۔

قدسیہ خالہ نے بڑے اطمینان سے بادیہ موری میں ٹھیک اس جگہ پھینکا جہاں ایک دن بوا نے پھینکا تھا۔

"اللہ کی مار ہو تجھ پہ —— یہ کیا کر رہی ہے۔" نانی بیوی چلائیں مگر خالہ بڑے اطمینان سے ڈھول اتار کر اس پہ وہ بول نکالنے لگیں جو حال ہی میں مہترانی سے سیکھے تھے۔

نانی بیوی نے جل کے ڈھول چھینا تو وہ زور سے جھٹکا اُن کا ہاتھ کر بڑی بی گرتے گرتے بچیں۔

"تمہارے اوپر بوجھ بن گئی ہوں تو مجھے زندہ دفن کرا دو۔ کتے کی موت کیوں مارنا چاہتی ہو۔ میں یہ زہر نہیں پیوں گی ہرگز نہیں پیوں گی۔ آج ہی انھیں پتہ چلا تھا کہ اُس دن شبیر میاں کو نانی بیوی نے بڑے سلیقے سے آنے کو منع کیا تھا۔

"تم تو اُسے بہت سمجھتے ہو میاں مگر دنیا بڑی ظالم ہے۔" انہوں نے سمجھایا تھا۔ اور شبیر میاں سمجھ گئے تھے۔

"ہاں دماغ خراب نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ انسان ہوں پتھر نہیں۔ پندرہ برس کی عمر میں مجھے بھاڑ میں جھونک دیا۔ سہاگ کی مہندی بھی پھیکی نہ پڑی تھی کہ سات سمندر پار چلا گیا۔ وہاں اُسے سفید ناگن ڈس گئی۔ پر یہ تو بتاؤ میں نے کیا قصور کیا تھا۔ کسی سے دیدے لڑائے تھے، کسی سے یاری کی تھی؟"

"تیرے پھوٹے نصیب بیٹی۔ خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے"

میں نے خدا کے حضور میں کونسی گستاخی کی تھی کہ مجھے یہ سزا ملی۔ اور وہ کمینہ عیش کر رہا ہے۔"

"بدنصیب، شوہر کو کمینہ کہتے شرم نہیں آتی....... وہ تیرا خدائے مجازی ہے"

لعنت ہو اُس کی صورت پہ۔ لُچا زمانے بھر کا" قدسیہ خالہ اور بڑھیں۔

اری کمبخت تجھے اپنے سہاگ کا بھی مان نہیں۔ اُس نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ شرع میں چار نکاحوں کا حکم ہے۔ تم ہی ایک نرالی نہیں ہو بنّو۔ ہزاروں پر پڑتی ہے مگر شرافت سے جھیلتی ہیں۔ مرد کی ذات ہی بے وفا ہوتی ہے"

لاجواب ہو کر قدسیہ خالہ خود کو کوسنے لگیں" یا اللہ مجھے اٹھا لے۔ اے پاک پروردگار میری مٹی عزیز کرے کہ اس عذاب سے تو جان چھوٹے یا اُس مردود کو موت دے کہ میرا دم ہی چھوٹے اُس نابکار سے"

"اری چڑیل یہ تو کسے کوس رہی ہے!" نانی بیوی کانپ اٹھیں۔ شوہر پھر شوہر ہوتا ہے۔

باقر حسین تمہارے چہیتے داماد کو۔ حرامزادے کُتیا کے جنے کو" قدسیہ خالہ گئیں ہاتھ سے" اُسے دوزخ کی آگ جلائے۔ قبر میں کیڑے بجبجائیں" وہ دوپٹہ پھیلا کر جھوم جھوم کر کوسنے لگیں۔

تو کیا دوسرا خصم کرے گی"

"ہاں کروں گی کروں گی" نہیں یہ قدسیہ خالہ نہیں تھیں۔ کوئی بھتنی تھی۔

"تو جا کوٹھے پہ کیوں نہیں بیٹھ جاتی"

کوٹھے پر بھی بیٹھ جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں کہ کوئی میرا کیا کر لیتا ہے" قدسیہ خالہ قطعی کوٹھے پہ بیٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ غصے میں بات سے بات نکلتی چلی گئی۔

نانی بی خوب نانا میاں کو یاد کر کے روئیں جس دن سے شبیر ماموں نے آنا بند کیا تھا ماں بیٹی میں یہ تو تو میں میں روز ہوا کرتی۔ قدسیہ خالہ کی سسرال تک بات پہنچ گئی۔ اُن کے سسر بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔

"اماں نے لاڈ میں دماغ خراب کیا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو بہو بیگم خاندان کی ناک کٹوائیں گی۔ بہتر ہے انھیں یہاں بلا لیا جائے۔ عقل درست ہو جائے گی۔" نانی بیوی بھی بھیجنے کو تیار ہو گئیں۔ اب وہ اُن کے قابو کی نہ تھیں۔

"ہاں بھئی وہ جانیں اور اُن کی بہو۔ میں کہاں تک مغز ماری کروں۔" نانی بیوی نے فیصلہ کیا مگر سسرال کے بلاوے کا ذکر سن کے قدسیہ خالہ بالکل بکھر گئیں۔

"بیٹے کو کچھ نہیں کہتا مکار کہیں کا۔ آگ اُس کی ڈاڑھی میں جھل لگے اُس کی صورت کو۔"

"اے بدبخت تیرا ماموں ہے!" نانی بیوی چلائیں۔

"تھو ہے ایسے ماموں کے جنم میں۔ جھوٹے منہ سے اپنے بیٹے سے نہ کہا گیا کچھ۔؟ ارے وہ تو بڑے خوش ہیں۔ میم آتی ہے تو تلو چپو کرتے ہیں۔ چھری کانٹے سے میز کرسی پر ڈنر کھاتے ہیں۔ بیٹے کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں نا۔ اس لئے میم کے سامنے کتّے کی طرح دُم ہلاتے ہیں۔ بس وہ میم ہی تو انھیں بخشوائے گی! اُسی کا سایہ پکڑ کے جنت ملے گی!"

"کیے جائے گی مُردی؟ اے خدا اس ناہنجار کا پردہ ڈھک لے! آگ لگے تیری زبان کو۔" انہوں نے جوتی سنبھال کے قدسیہ خالہ کے ہونٹ کچل دیئے۔

پھر تو بس اُن پر جیسے مرگھٹ کی بھتنی سوار ہو گئی۔ دانت کچکچا کر انھوں نے نانی بیوی کی دونوں سینک سلائی جیسی کلائیاں مروڑ کے رکھ دیں۔ ایک پل کو نانی بیوی نے اُن کی بپھری ہوئی آنکھوں میں دیکھا اور اُن کا کلیجہ سن سے رہ گیا۔ وہاں اُن کی عزیز از جان بیٹی قدسیہ بانو نہیں تھیں۔ چوٹ کھائی شیرنی تھی کہ پھن کچلی ناگن! جس کی آہنی گرفت میں اُن کی جان کھنچنے لگی۔ لرز کے بڑی بی دہری ہو گئیں۔ "ہائیں ہائیں!" کہہ کے سب دوڑ

پڑے۔ شکاری کتوں میں گھری ہوئی ہرنی کی طرح وہ سر پیر سے لرزنے لگیں۔ ہائے یہ کیا کیا قدسیہ بندی تو نے؟ اماں بی کے اوپر تیرا ہاتھ اٹھا! ہر طرح بے بس ہو کر انہوں نے دونوں ہاتھ چبوتری پر پڑی ہوئی سل پر دے مارے۔ چوڑیاں چکنا چور ہو گئیں۔

اے ہے لوگوں کیا ہو رہا ہے" بہری دادی اماں کا دم گھٹ رہا تھا" اے لڑکیو ذرا چراغ کی لو تو اکساؤ۔۔۔۔ کیا ہو رہا ہے؟ لالٹین دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ مگر دادی اماں کا اندھیرا کون دور کر سکتا تھا۔ اندر باہر کھلبلی پڑ گئی۔ سارے نوکر جھٹ لگا کے صدر دروازے کے پاس جمع ہو گئے۔ چاروں طرف سے بیویاں پائنچے سنبھالتی دوڑیں۔ بچے بسورنے لگے مرغیاں کڑ کڑانے لگیں۔

خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ قرآن پاک کی قسم سر پھاڑ دوں گی! قدسیہ خالہ نے سل کا بٹہ سر سے اونچا اٹھایا۔ سب کو اپنی جان پیاری تھی۔ سب ہائے توبہ مچاتی رہیں۔ آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ قدسیہ خالہ نے بٹہ پھینک کر پیاسا بے پیا شیشہ بٹورنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ ہونٹوں تک پہنچے۔ شبیر ماموں نے بڑے اطمینان سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

دس برس بعد کسی مرد نے انھیں ہاتھ لگایا۔ ان کے ہاتھ بے بس ہو کر نیچے گر گئے۔ مڑ کر انہوں نے شبیر حسن کی آنکھوں میں دیکھا! اس وقت تک تو وہ بہشت بریں سے بھی لوٹ آتیں۔ آنکھیں موند کر وہ تیورا کر ان کے سینہ پر گریں۔

ایک لمحہ کو شبیر حسن کے ناکارہ ہاتھ ٹھٹکے۔ پھر انہوں نے سب کے سامنے خالہ کو اتنی زور سے کلیجہ سے بھینچا کہ ان کی پسلیاں کڑ کڑا گئیں۔ سارے کنبے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہم لوگ اکڑی بکڑی چھوڑ منہ پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ ایکدم فضا نے دم سادھ لیا۔ نانی بیوی ٹوٹے چھپر کی طرح ڈھے گئیں۔

کیا ہو رہا ہے لوگو!۔۔۔۔ یہ چپکا کیوں پڑ گیا۔۔۔۔۔ دادی اماں سجدہ

گاہ ٹٹول کے تکیے کے نیچے نکالنے لگیں۔ سب نے نیت باندھ لی کہ کوئی نہیں بولتا۔ ؟
شبیر حسن نے اُن کا نحیف و نزار جسم دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ ایسا لگا اب وہ کبھی ان ہاتھوں سے انھیں دور نہ ہونے دیں گے۔ اسی طرح انھیں اٹھائے چلے جائیں گے۔ کسی میں زور سے سانس لینے کی ہمت بھی نہ تھی۔ انھوں نے دل پر پتھر رکھ کے ہولے سے قدسیہ خالہ کو پلنگ پر ڈال دیا اور بے تعلق دور کھڑے ہو کر فرش گھورنے لگے جیسے کہتے ہوں۔ "لو بھئی یہ پڑی ہیں قدسیہ بانو۔ اس وقت بے ہوش ہیں۔ اچھا موقع ہے چپکے سے کوئی آؤ اور گلا گھونٹ دو۔ جھنجھار کے نہ مارو۔"

حکیم صاحب قبلہ نے فوراً نبض دیکھ کر کہہ دیا کہ سر کو گرمی چڑھ گئی ہے صاحبزادی کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ اللہ ہے۔ اللہ پاک کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔
بکت ہیں بیدجی۔" بدبو دار پٹھانی نے لہنگا جھاڑتے ہوئے فیصلہ کیا۔ "ہم کا تو کچھ اور ہے دکھائی پڑت ہے۔"
"ہاں بھئی مجھے بھی ایسا لگے ہے جیسے بوا نگوڑی کا جن انھیں چھوڑ کے بچی پر ملیش ہو گیا ہے۔ دیکھتی نہیں بہن جوں جوں بوا اسد ھرتی گئیں قدسیہ بانو کے طور بگڑنے لگے۔ باقری پھپھو نے نانی بیوی کو یقین دلایا۔ "غضب خدا کا جیسے کپڑے پہن

کے لاڈو عطر پھلیل لگا کے وقت بے وقت چمن میں ٹہل لگایا کرتی ہیں۔"

ایکدم قدسیہ خالہ کی پوزیشن اونچی ہونے لگی۔ اب وہ اکیلی نہیں تھیں جن بھوت پریت یا کوئی پیر مرد بھی اُن کے ساتھ تھے۔ ہماری اماں بیچاری فوراً اُن سے نہایت مرعوب ہوگئیں۔

اماں تو بس اللہ میاں کی گائے تھیں، ہر عقل میں نہ آنے والی چیز سے احتیاطاً ڈرتی رہتی تھیں۔ پیر مرید، بھوت پریت اور جن وہ کوئی بھی ہو وہ کسی سے الجھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ تو اس پئے ست نزاُن کے لئے بھی چندہ دے دیتیں پانچ ٹانگ کی گائی کو گھاس کھلواتیں، سانپوں کو دودھ پلواتیں۔

بیٹی یہ کفر ہے۔" نانی بیوی سمجھاتیں۔" نذر نیاز کی اور بات ہے مگر یہ موئی کتھا میں اپنی عاقبت نہ بگاڑو۔"

مگر اماں کو عاقبت سے زیادہ اپنا سہاگ اور بچے پیارے تھے۔

ارے بھئی کیا پتہ یہ دیوی دیوتا بگڑ کھڑے ہوں تو ان کا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔ قبرستان سے لگا ہوا شمشان بھومی تھا بچے بے نتھے۔ بیلوں کی طرح ہر طرف دندناتے پھرتے۔ ایک دفعہ کسی مندر میں کچھ بھگوان کا اپمان کر آئے۔ مہنت جی دہائی دیتے ہوئے آئے۔ اماں نے فوراً پرائشچت کے لئے بامن کھلوائے کہ دیوتا غصہ میں تختہ نہ لوٹ دیں مندر سے پرساد آتا تو سب بیویاں تھو تھو کر کے کہتیں" مرغیوں کو ڈالو نجس ہے۔" مگر اماں طاق میں رکھ دیتیں۔ بچے فوراً ٹھکانے لگا دیتے تب انھیں اطمینان ہوتا۔ بچے تو پتھر بھی کھالیں تو ڈکار نہ لیں اور پھر کسی کو کیا پتہ شاید پرساد میں برکت ہو۔

قدسیہ خالہ کی بھی وہ سیوا میں جٹ گئیں۔ ہر شخص کی بات سے اتفاق کر کے جن بھی اتروائے، بھوت پریت بھی منائے۔ پیروں کی نیازیں بھی دلوائیں۔ اُن کی بے طرح خاطر کرنے لگیں۔ اس نئی قدسیہ سے انھیں وحشت ہوتی تھی۔ پاگل ہونے کے سوال پر وہ

بالکل نیوٹرل تھیں۔ کون جانے پاگل بھی کسی قسم کی روحانی طاقت رکھتے ہوں۔ بال بچوں والی کو تو ہر طرف سے چوکنا رہنا چاہیئے تاکہ کسی زاویئے سے کسی قسم کے خطرے کی گنجائش نہ رہے اور جن لوگ تو بڑے ٹیڑھے مزاج کے ہوتے ہیں کہ پاک پروردگار نے انسان اولیٰ مٹی سے بنایا اور جنوں کو آتش سے۔ آگ بھڑک گئی تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔

یہ تو صاف ظاہر تھا کہ خالہ پر کوئی بھوت پریت نہیں جو انھیں گو اُچھالنے کی ترغیب دیتا۔ کوئی نہایت مہذب فیشن ایبل قسم کے بحید شوقین مزاج پیر مرد کا سایہ معلوم ہوتا تھا۔ قدسیہ خالہ کی نازبرداریاں دیکھ دیکھ کر ایک چچامیاں تھے جو کلستے تھے انھیں بھی اللہ پاک نے دہکتی سے نہ سہی مگر بھوبل سے ضرور بنایا ہوگا۔

"قدسیہ بانو بڑی چنٹ ہو خوب سارے گھر کو اُلّو بنا رہی ہو۔"

چچامیاں مسکرائے مگر سب جانتے تھے۔ وہ نہایت ملحد مرتد اور نابکار قسم کے انسان تھے سب انھیں لعنت ملامت کرتے۔

"حکیم صاحب قبلہ کے تین زناٹے دار جلاب دیئے جائیں، پیر مرد کے چھکے چھوٹ جائیں گے؟" وہ کفر بکتے اور نانی بی ماتھا کوٹ لیتیں۔

آگ لگے تیری زبان کو وہ نگوڑی تن بدن کی سدھ کھو بیٹھی ہے۔ اور تو ہے کہ بکے جاوے ہے۔" وہ قدسیہ خالہ پر بحید ماتا توڑنے لگی تھیں بات بات پر گلا بھر لاتیں اور نانا میاں کو یاد کرنے لگتیں۔ وہ زندہ ہوتے تو غریب کو تیری میری سننا نہ پڑتی۔ وہ قدسیہ خالہ کے لیئے فالسوں کا شربت بنانے لگتیں۔

"دے ہم ان کے چلتر خوب سمجھتے ہیں۔ شبیر ماموں سے ملنے کا۔۔۔۔"

قدسیہ خالہ بال سلجھاتے سلجھاتے اُن سے الجھ پڑتیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکراتیں۔

"کیا مشتری جان نے جوتیاں مار کے نکال دیا۔" وہ چٹکی بھرتیں سب جانتے تھے کہ چچا میاں رنڈیوں کی کمائی پر عیش کرتے تھے!

"میرا ذکر چھوڑو...... تم اپنی کہو......"

"قدسیہ بیٹی" نانی بیوی انھیں شربت کا گلاس تھما کر اُن کا رخ موڑ دیتیں۔

"اس کم ظرف کے منہ نہ لگا کرے موا موری کا کیڑا سب کو اپنی طرح سمجھتا ہے۔" نانی بیوی اچانک اُس حادثہ کے بعد سے نہایت پُرد قدسیہ ہو گئی تھیں۔

"صاحبزادی پر کسی نہایت جلالی پیرمرد کا سایہ ہے۔ انھیں حتی الامکان اشتعال نہ دلایا جائے۔" تائی اماں کے لکھنؤ والے مولانا نے فتویٰ دیا تھا۔ حکیم صاحب قبلہ کی بھی ناچیز رائے تھی کہ فی الحال جلاب ملتوی رہیں۔ اس لیے جذبات کو بھڑکانے سے احتراز کیا جائے۔ ورنہ سر پہ اور گرمی چڑھ جائے گی۔ مگر کوئی چچا میاں کو کیسے سمجھائے۔ پاگل ہو کر تو قدسیہ خالہ کے عیش ہو گئے۔ دولی کے گالوں پہ بالی جانے لگیں۔ بالکل شہزادیوں کی طرح صاف شفاف چادر کسی پلنگڑی پہ نیم دراز سودا اور ذوق کے کلام سے لطف اندوز ہوا کرتیں۔ شبیر حسن میٹھے میٹھے لہجے میں شعر پڑھتے۔ وہ انھیں بوکھلانے کے لیے کسی نازک سے شعر کے معنی پوچھ بیٹھتیں۔ وہ پہلے کی طرح آنے لگے تھے اور اگر آنے میں دیر ہو جاتی تو قدسیہ خالہ اُٹھک بیٹھک شروع کر دیتیں۔ چچا عام طور پہ بد ذاتی پر تل جاتے تھے، مگر اس دن تو وہ بڑھتے ہی چلے گئے۔ قدسیہ خالہ نے شربت کا گلاس ہونٹوں سے لگایا مگر گھونٹ نہ بھرا۔

"عجیب منحنچو ہیں یہ تمہارے شبیر حسن! ہم ہوتے تو......" انہوں نے ہولے سے ایسے منہ میں کہا کہ نانی بیوی نہ سن پائیں۔

تم ہوتے تو؟" قدسیہ خالہ نے دانت پیسے۔

"لے کے بھاگ جاتے!" چچا میاں نے لمبی چوڑی انگڑائی کے ہاتھ پھیلائے۔"

کمینے، مجھے بھی کیا اپنی مشتری جان سمجھا ہے۔" قدسیہ خالہ ننگی تلوار بن گئیں۔

"ہر عورت میں کہیں نہ کہیں مشتری جان چھپی ہوتی ہے اور موقع پا کر۔"

قدسیہ خالہ نے شربت کا بھرا گلاس چچا کے منہ پر کھینچ مارا اور پیر سے ننھی سی سلیم شاہی جوتی گھسیٹ اُن پر ٹوٹ پڑیں۔

اگر ہوش کھو کر یوں دونوں جہان کی بادشاہی مل جائے تو کون کمبخت ہوش میں آنا چاہے گا۔ پہلے اگر یہی قدسیہ بانو اونچی آواز سے بولتیں تو سب نام دھرنے لگتے۔ آج وہ چھ فٹ تین انچ کے دیو ہیکل مردوے کی جوتی کاری کر رہی تھیں۔ ایک سانس میں سو گالیاں دے رہی تھیں اور سب منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے تھے، بلکہ عش عش کر رہے تھے۔

"ارے ارے نیک بخت میں تو مذاق کر رہا تھا" دونوں ہاتھوں سے وہ وار روک رہے تھے۔ وہ چچا میاں جنھوں نے صدیق پہلوان کو مشتری جان کے پیچھے اٹھا کر چھ فٹ اونچی دیوار کے پار پھینک دیا تھا۔ جیسے صدیق ہاتھی کا بچہ نہیں پھولوں کی گیند تھا۔ وہ قدسیہ خالہ سے پٹ رہے تھے۔ اس دن تو ہم سب بھی قائل ہو گئے۔ یہ دھان پان سی ٹِلکنا سی قدسیہ خالہ پہلوانوں کے ہاتھ نہیں دکھا رہی تھیں۔ یہ تو وہ جن تھا جو اُن پہ عاشق تھا۔ اور جس پہ جن مرتے ہوں اُس سے کون اُلجھے؟

ایک لق دق کوٹھی میں ہر کونہ ایک جدا صوبہ کی طرح بے تعلق ہو جاتا ہے۔ عرس کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ تیج تہوار کے علاوہ مہمانوں کے آنے کا یہ ایک حیلہ تھا۔ مہینوں پہلے سے دور دراز کے جان پہچان اور رشتہ والے آنے شروع ہو جاتے۔ کوئی الگ کمرے غسل خانے تو دیئے نہیں جاتے کہ کچھ فرق پڑے۔ بس چارپائیاں کھٹولے تخت اور بچھا دیئے جاتے دسترخوان لمبا کر دیا جاتا۔ ایک رکابی میں دو دو کھانے لگتے۔ قطعی کوئی تکلیف نہیں ہوتی بس بھرے بازار کا سا ہلڑ مچا رہتا جس میں بڑا مزہ آتا۔ ننھیال ددھیال کے دو کیمپ جب

ضرورت چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتے۔ عجب سماں ہوتا۔ دادی اماں کی طرف زیادہ بڑھیاں سمٹ آتیں۔ جن کے سامنے ہلو بھی تو اختلاج کے دورے پڑ جاتیں۔ نانی بیوی کے ہاں عموماً اماں کی ہم عمر بھکڑ ہنسوڑ اور دنیا دار قسم کی بیویاں جمع ہو جاتیں۔ وہ جن کے دودھ پیتے بچے اور شوہر ساتھ ہوتے۔ بالکل الگ تھلگ دو دو پلنگ ڈال لیتے۔ نو عمر لڑکیاں بالکل دوسری سمت ایک ایک پلنگ پر دو دو سوتیں۔ باقی وقت ایک ریوڑ کی صورت میں کانا پھوسی کیا کرتیں۔

بچے، مرغیاں، کبوتر اور کتے بیچ صحن میں پیڑوں کے نیچے کھرّے پلنگوں اور چوکوں پر دند مچایا کرتے۔ ایک کونے میں کوئی حادثہ ہوتا تو عوام کو خبر ہوتے ہوتے کچھ وقفہ لگ جاتا۔

اس لئے چچا کی جوتے کاری کے بہت کم چشم دید گواہ تھے۔ جب تک بیویاں جوتے پہن کر پائنچے سنبھالتی آئیں آئیں، بجلی کی سرعت سے ہونے والے حادثات کا نام و نشان بھی نہ ملتا تھا۔ جب سب جمع ہوئے تو قدسیہ خالہ دوپٹے سے منہ چھپائے پھنکار رہی تھیں اور چچا میاں سرپٹ دروازہ کی طرف ہنستے ہوئے جا رہے تھے جیسے انہیں جوتیاں نہیں بالوشاہیاں مل گئی ہوں۔

"اے لڑکیو کیا ہو رہا ہے۔ بھئی ہمیں تو کوئی بتاتے ہی نہیں ہے!"

دادی اماں کراہیں۔ اُن کے ساتھ کی تمام تھکی ہوئی بڑھیوں نے کروٹ بدل لئے اور پھر اونگھنے لگیں۔

"کیا ہوا، کیا بات ہوئی؟" اب سب ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

کسی کو پتہ نہیں تھا کہ بدبودار پچھائی اور راد پہ کے کام کے چھوکرے میں ہاتھا پائی ہوئی تھی یا سانپ نکل آیا تھا۔

"کس نے مارا کسے مارا؟" سب پھر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ بچوں

والیاں اپنے بیچے گن رہی تھیں۔ اماں سب باتوں سے بے نیاز پانچے اڑس کر، ابا کی ٹم ٹم کی گھنٹی کی آواز پر پیا ملن کے لئے جا رہی تھیں۔

"اے ہوتا کیا؟ میرا سر!" نانی بیوی چشم دید گواہوں میں ہوتے ہوئے بھی پراسرار بن رہی تھیں۔ "اُن کے منھ جوٹ لگے گا وہ بھگتے گا۔" اُن، سے مراد قدسیہ بیگم ہرگز نہ ہوں گی وہ غریب دھان پان! نگوڑی میں دم ہی کہاں تھا! ساری کرامات پیر مرد کی تھی۔



بڑی اداس سی شام تھی۔ آسمان پر باریک سی گرد و غبار کی چادر تنی ہوئی تھی۔ ابابیلیں قینچیوں کی طرح ہوا کو کترتی ہوئی سپاٹے بھر رہی تھیں۔ عرس میں شرکت کرنیوالے قوالوں کی ٹولیاں آنے لگی تھیں۔ لمبے چوڑے شامیانے کی دن بھر مرمت ہوا کرتی۔ درگاہ تازہ قلعی کے بعد سفید براق ہو جاتی تھی۔ جیسے کسی نے بہت سا سفید مارکین کھونے کے اونچا نیچا ڈال دیا ہو۔ ان دنوں ہم گھر کو بھول کر درگاہ کے ہو رہتے تھے۔ وعظ سے ہمیں رونا آنے لگتا تھا مگر قوالی میں خوب مزہ آتا۔

سراجم منیرا نگارِ مدینہ تجلّی مکہ بہارِ مدینہ

مطلب خاک پلّے نہ پڑتا مکہ مدینہ کے ذکر سے ہم مرعوب ہو جاتے پھر کسی اللہ والے کو حال آ جاتا اور خوب اودھم مچتی۔ قوال ایک ہی شعر پہ اٹک جاتے

اور وہی دہرائے جاتے۔ یہاں تک کہ بور ہو کر حال کھیلنے والا سُست پڑ جاتا۔ اور قوال نیا قطعہ شروع کرتے۔

"کیا ہوا لوگو ہمیں بھی تو بتاؤ" ہم اندر آئے تو دادی اماں مِنمنا رہی تھیں۔

بُوا کی چمارن سب کے پیر پڑتی پھر رہی تھی۔

"ارے کوئی چل کے دیکھو رام جانے اُو کا کا ہوئی گوا"

"ہے ہے کیسے؟"

"کیا ہو گیا؟" سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ اور جب معلوم ہوا کہ بُوا کو تین چار دن سے بخار تھا۔ کل رات کو نہ جانے کب نکل کھڑی ہوئیں۔ صبح قبرستان میں اوندھی پڑی ملیں تب سے گھانٹی چل رہی ہے۔

"ہے ہے نگوڑی!" بیویاں افسوس کرنے لگیں۔ پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں "ہم پوچھیں تو کوئی بتائے نہیں ہے۔ کتا ہیں کہ جھونکے جا دیں ہیں کیا مجال جو کوئی کان دھرے" دادی اماں نے تکیہ تلے سے سجدہ گاہ نکال اور نیت باندھ لی۔ نانی بیوی اُن کے نیت باندھنے کے انداز پر توبہ توبہ کرتی تھیں۔ سجدہ پہ بھی اعتراض تھا۔ جیسے سینڈ کی ڈبکیاں کھا رہی ہو۔

ایک قدسیہ خالہ تھیں بے کل ہو رہی تھیں۔ ہڑبڑائی ہوئی اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں۔

"اے ہے کوئی ڈاکٹر سے جا کے کہو" درگاہ کے ہسپتال کا ڈاکٹر مفت علاج کرتا تھا۔ کسی کو قدسیہ خالہ کی بلبلاہٹ پر تعجب نہ ہوا مگر اُن کا حکم ٹالنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

رات بھر بُوا کی گھانٹی چلتی رہی۔ ڈاکٹر نے کہا ڈبل نمونیہ ہے۔ صبح ہم لوگ بھی دور سے انھیں دیکھنے گئے۔ عیادت کو نہیں۔ یونہی۔ بوا جھلنگے میں پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھیں

وہ بدبو تھی کہ ناک نہیں دی جاتی تھی۔ تیسرے دن کہیں جاکے گھانٹی کی گھر گھراہٹ بند ہوئی۔

اللہ توبہ توبہ۔ سفید کفن میں اینٹھی ہوئی بوا کس قدر ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ کس غضب کی نامرادی اور پھٹکار تھی چہرے پہ۔ ادھ کھلی گھومی ہوئی آنکھیں، اودا اودا رنگ، منھ اور ناک سے گلابی گلابی پانی رس رہا تھا۔ برسوں رات کو خواب میں آکے ڈراتی رہیں۔ اندھیرے میں جاتے دم نکلتا کہ بوا نہ کھا جائیں۔ جھٹپٹا ہوتے ہی دم فنا ہونے لگتے کلیاں چننے جانے کی ہمت نہ ہوتی معلوم ہوتا مسجد کے پچھواڑے بیٹھی ہیں۔ برگد کے نیچے کھڑی سلیپر میں سے ریت جھاڑ رہی ہیں اور ابھی ادھر سے ڈھول بجاتی "میرٹھ میں ملیں گے دو نوں جنے" گاتی آجائیں گی۔

بالے میاں سے بہت روٹھا کرتی تھیں، مگر جب وہ روٹھے تو جگ سے منھ موڑ لیا۔ بوا کی یہ گت ہوئی اور انھوں نے پلٹ کر نہ دیکھا ہائے نگوڑی بوا۔ لوگ خواب دیکھنے پر بھی پہرا بٹھاتے ہیں۔ جینے کا کوئی سہارا ہو دنیا کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے گا۔

سارے گھر پر بوا کی موت کی ہیبت بیٹھ گئی۔ سب ہی کے ہاتھوں پر اُن کے معصوم خون کے دھبے تھے۔ گھر کو بلاؤں سے پاک رکھنے کے لئے فوراً دو ملّا نے ڈیوڑھی پر بٹھا دیئے گئے۔ صبح شام ہل ہل کے سیپارے پڑھا کرتے تھے اور بھر بھر سینیاں روٹیاں ٹھونستے ــــ!

بوا کی موت نے قدسیہ خالہ کے پیر اکھاڑ دیئے۔ دو دن تک اُن کے منھ میں کھیل تک اڑ کے نہ گئی۔ رات رات بھر دیوانگی کے عالم میں چکر کاٹتیں۔ اندھیرے آنگن میں خاموش سر جھکائے فرش کو گھورا کرتیں جیسے اُس میں کوئی سند ڈھونڈ رہی ہوں کہ پا جائیں تو وہیں سما جائیں۔ پیاسی چڑیا جیسی آنکھیں پھاڑے اپنے چاروں طرف مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں کہ کوئی خوں آشام درندہ جست مار کر گلا نہ دبوچ ڈالے۔ ہر طرف موت منڈلاتی

نظر آتی۔ نانی بیوی شربت بنا کے دیتیں۔ یہ چپکے سے آنکھ بچا کے اگالدان میں انڈیل دیتیں
پان مٹھی میں دبا کر جھوٹ موٹ منہ چلانے لگتیں پھر جا کے پاخانے میں پھینک آتیں۔
صرف اماں کی رکابی سے نوالہ لیتیں۔ انھیں کسی پر بھروسہ نہ رہا تھا۔

اس شام شبیر ماموں آئے۔ گھڑی بھر ادھر ادھر چوروں کی طرح دیکھتے رہے۔
بغیر آنکھیں ملائے دیوان غالب کی جلد قدسیہ خالہ کو دی۔ دادی اماں کو سلام کیا پھر اٹھ
کر بغیر قدسیہ خالہ پر نظر ڈالے چلے گئے۔

قدسیہ خالہ دونوں ہاتھوں سے کتاب دبوچے ایسے بیٹھی تھیں کہ اگر کھل گئی تو
اژدھا نکل کے انھیں ڈکار جائے گا۔ نانی بیوی ان کا بستر ٹھیک کر رہی تھیں۔ بڑے
پیار سے تکیہ پر پھول سجا کر انھوں نے دُلائی تہہ کر دی۔

"لو بیٹی ذرا کے ذرا لیٹ رہو۔ تمہارا کھانا ادھر ہی لے آؤں گی۔ اُدھر تو خو گیر
کی بھرتی ہوئی ہے۔ انھوں نے برآمدے میں لگے طویل دسترخوان کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے اماں بی۔" انھوں نے کتاب تکیہ کے نیچے رکھ دی۔

"کیوں بیٹی — دوپہر کو بھی منہ جھٹال کے اٹھ گئیں — اور —" حالانکہ
انھیں گمان بھی نہیں تھا کہ بیٹی اُن پر شک کرتی ہے۔ آخر کو ماں تھیں۔ اکلوتی بچی پر ہمیشہ
ہی جان جاتی تھی۔ اپنی دانست میں وہ جو کچھ کرتی تھیں اُس کی بھلائی کے لیے کرتی تھیں۔

ایکدم قدسیہ خالہ کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ چچا میاں جھک کر کتاب اٹھا رہے تھے۔

قدسیہ خالہ پر جاڑا بخار کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک ننھا سا کاغذ کا پرزہ ہوا
میں لرزتا ہوا قدسیہ خالہ کے قدموں میں گرا اس سے پہلے کہ وہ اٹھاتیں چچا میاں نے
پیر رکھ دیا۔ جھک کر اٹھایا بغیر کھولے الٹ پلٹ کے دیکھا اور نانی بیوی کی طرف بڑھا
دیا۔ قدسیہ خالہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا ہے؟" انھوں نے پرچہ لے کے دیکھا پھر پھینک دیا۔ "چل ہٹ"۔ نانی بیوی

کب ڈھتیں۔ ایک حرف نہ پڑھ پاتی تھیں۔

"ایسے ارے تعویذ ہے بے ادبی نہ کرو" انھوں نے پرچہ اٹھا کے قدسیہ خالہ کے تکیہ پر رکھ دیا۔

"کیسا تعویذ؟" وہ ایکدم مؤدب ہوگئیں۔

"بھوت اتارنے کا۔"

"اونھ بھئی میں تمہارے ساتھ کی کھیلی تو ہوں نہیں کہ لگے مذاق کرنے۔" نانی بیوی بگڑ کر چلی گئیں۔

"ساتھ کے کھیلے کب گنتی میں لاتے ہیں۔" وہ دبی زبان سے کہتے دادی اماں کے برآمدے میں چلے گئے۔

"اماں بیگم! فتح پور والی زمین میرے نام کردو نہیں تو امام حسینؑ کی قسم سُنّی ہو جاؤں گی۔"

"مُوا رکابی مذہب!" نانی بیوی بڑبڑائیں۔

"آمیٹھی والے آموں کے باغ میرے نام جلد کردو تو ابھی سُنّی ہو جاتا ہوں۔" وہ نانی بیوی سے الجھتے۔

"اوئی! وہ تو قدسیہ کے نام ہیں۔"

"کوئی مضائقہ نہیں قدسیہ کو بھی ہبہ کردو میں سب سے سمجھ لوں گا!"

"تیرے منہ میں خاک!" نانی بیوی جوتی سنبھالتیں اور وہ ممانی کو چلانے لگتے۔

"بھابی یہ کڑے دیدو تو تمہاری ساری سوتوں کی ناک چوٹی کاٹ کے تمہارے قدموں میں رکھ دوں۔" مگر کوئی انھیں کچھ نہ دیتا کہ وہ اپنی ساری جائداد رنڈیوں میں پھونک چکے تھے۔

تہجد کی نماز پڑھنے نانی بیوی اٹھیں تو تیمم کے لئے اٹھیں ہوئے ہاتھ جہاں کے

تہاں معلق رہ گئے۔ قدسیہ خالہ کی پلنگڑی خالی پڑی تھی۔ تکیہ کے پھول جوں کے توں مہک رہے تھے۔ ایک پتی نہ ملی تھی۔ صدر دروازہ بھاڑ کی طرح کھلا تھا۔ کنڈی ابھی تک ہل رہی تھی۔

نانی بیوی کی چیخیں سن کر جگار ہوگئی۔ وہ کونے کونے میں قدسیہ کو پکارتی پھر رہی تھیں۔ ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو لالٹینیں لے کر لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

"ارے یہ کیا ہو رہا ہے ہمیں نہ بتاؤ گے لوگو!" دادی اماں گھگیا کر سب کو بوکھلا رہی تھیں۔ نانی بیوی کو اماں چھوٹی سی بچی کی طرح کندھے سے لگائے دلاسا دے رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" مختلف کونوں سے پوچھا جا رہا تھا۔ بچے ٹھنکنے لگے۔ مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔"

تالے ہے شاید ڈربہ کھلا رہ گیا۔ نیند میں تائی اماں سمجھیں بلی مرغی لے گئی۔

قدسیہ خالہ کے چھوٹے چھوٹے برہنہ پیروں کے نشان باؤلی کی مینڈ تک تو ملے پھر ختم ہوگئے۔ دائیں طرف اسٹیشن جانے والی پگڈنڈی پر سینکڑوں مویشیوں اور انسانوں کے نقشِ قدم نظر آئے مگر انھیں قدسیہ خالہ کے ننھے ننھے سفید پیروں کا ایک بھی نشان نہ تھا۔ باولی کی تہہ لے ڈالی مگر قدسیہ خالہ کی لاش نہ ملی۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا

"جنتی بیوی تھی میری بچی۔" تیجے کے دن نانی بیوی نے رو رو کر برا حال کر لیا۔

"کیوں روتی ہیں۔ وہ جہاں گئی ہے اللہ اسے غریق رحمت کرے۔" چچا نے سوکھے آنسو پونچھے۔ کس قدر ذلیل تھے۔ ہمارے چچا میاں۔

"آمین!" نانی بیوی نے بُد بُد درود پڑھنا شروع کیا۔

کچھ دن بعد ان کے لئے عجیب عجیب قصے مشہور ہونا شروع ہوئے۔ کہ جب وہ باولی میں کود پڑیں تو چھن سے تہہ میں ایک کھڑکی کھلی۔ کیا دیکھتی ہیں لق و دق میدان ہے، ہو کا عالم، آدم نہ آدم زاد، سامنے سے غبار اٹھتا نظر آیا۔ جب دھند چھٹا تو کیا

دیکھتی ہیں کہ ایک تخت زریں بت کو زرنگار تکیوں سے آراستہ ہے۔ چار پریاں تخت کے چاروں کھونٹ سنبھالے ادب سے جھکائے کھڑی ہیں۔ انھیں تخت پر بٹھایا گیا۔ اور آسمان کی طرف اڑ گیا۔"

یہ قصے چچامیاں گڑھ گڑھ کے سنایا کرتے تھے۔ کچھ بد مذاق لوگ یہ بھی کہتے تھے۔ وہ شبیر ماموں کے ساتھ بھاگ گئیں۔ کچھ بھی ہو قدسیہ خالہ کا نام لینا اس دن سے گناہ ہوگیا۔ جب تک نانی بیوی زندہ رہیں اُن کے ڈر سے کوئی ذکر نہ کرتا۔ پھر سب بھول بھال گئے۔ کہ بھول جانے میں بڑے فائدے ہیں۔ ضمیر ملامت نہیں کرتا۔!

کوئی دو ڈھائی مہینے ہوئے ایک ٹیلیفون آیا۔

"میں رفیعہ حسن بول رہی ہوں۔ وکٹوریہ ٹرمینس کے مسافر خانے سے بول رہی ہوں۔ صبح کے پلین سے لندن جا رہی ہوں۔ کچھ وقت دے سکیں تو......" وہ پی ایچ ڈی کرنے جا رہی تھی۔ بڑی آکسفورڈ آئی۔ کوئی ادب نواز ہوگی۔ خواہ مخواہ ذہنی گھسے پٹے بلے دہرا کر جی جلائے گی۔ بڑے ادیب نئی پود کو ابھرنے نہیں دیتے۔ گٹھ بنائے بیٹھے ہیں۔ بس ایک دوسرے کو اُچھالتے ہیں۔ مجھے موقع پرست اور جانبدار ثابت کرے.... دراصل....." میں کوئی اَن گڑھ سا بہانا سوچنے لگی۔

میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ بس دس منٹ کافی ہوں گے۔ وہ بڑی ہوشیار

معلوم ہوتی تھی۔

وہ آئی تو بڑے پیار سے مجھے دیکھکر مسکرانے لگی۔ اُسے دیکھ کر آپ ہی آپ جی ہلکا ہو گیا۔

"آپ کا پتہ بڑی مشکل سے ہاتھ آیا۔ آپ کو تو شاید یاد نہ ہو۔ آپ میری رشتہ کی بہن لگتی ہیں۔ میری امّی قدسیہ شبیر حسن آپ کی خالہ ہوتی ہیں۔"

"قدسیہ خالہ۔ تم قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں کی لڑکی ہو" میں احمقوں کی طرح ہکلانے لگی۔ میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے! ابّا کی رسیلی آواز میری یادداشت کے پٹ جنجھوڑنے لگی۔ تو دونوں مل ہی گئے۔ بعض انسان مر کے دوسروں کو جینے کا سلیقہ سکھا جاتے ہیں!

"اور عین وقت پر امی کی ہمت جواب دے گئی۔ ابّو سے لڑ پڑیں کہ مجھے گمراہ کر کے گناہ گار کر رہے ہو۔ مگر مستقیم ماموں۔۔۔۔۔۔"

"مچھو چچا میاں!" جنت تو کیا نصیب ہوگی۔ مرحوم کو مگر خیر اللہ بڑا رحیم و کریم ہے

"امّی کی تو انھیں دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ وہ تو باؤلی ہیں کود کر جان دیئے دے رہی تھیں۔ مگر مچھو ماموں نے کہا۔ یہ جوتے چھوڑ کر ننگے پیر آگئیں۔ یہ تو پہنتی جاؤ نہیں تو پاؤں بھیگ گئے تو زکام ہو جائے گا۔"

"چچا میاں نے کہا؟"

"ہاں اور جیب سے امی کی جوتیاں نکال کے دیں۔ مگر امی بکھری جاتی تھیں کہ مجھے مر جانے دو۔"

"مگر اُن کے پیروں کے نشان؟"

"وہ کیسے ملتے ابّو نے انھیں اٹھا لیا۔" وہ ہنس پڑی "اب تو امی اتنی موٹی ہو گئی ہیں کہ سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ وہاں سے پیدل اسٹیشن گئے۔"

قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں ساری عمر چوروں کی طرح چھپتے رہے معمولی سے عام انسان ویسے ہی گمنام رہتے ہیں۔ پھر بھی خوف تو رہتا تھا حالانکہ چچا میاں نے انھیں یقین دلا دکھا تھا کہ اگر اس نے کچھ گڑبڑ کی تو اُس کا قصہ ہی پاک کر دیں گے۔

"اور خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی" قدسیہ خالہ کہا کرتی تھیں۔

"وہاں تم پچھاڑ کھا کے ایک کونے میں بیہوش ہو جانا۔ میں سب سمجھ لوں گا"

چچا تسلی دیتے۔

"پھر جب طلاق بل پاس ہوا تو وہ برٹش نیشنلیٹی لے کر انگلستان جا بسے تھے۔ دوسرے میں سیانی ہو چکی تھی۔ پھر نئے سرے سے ہنگامہ کھڑا کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہوئی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ امی اور ابو کی محبت کو دیکھ کر شادی بیاہ اور طلاق کی اہمیت پر ہنسی آنے لگتی ہے، شائد اس لئے کہ میں نورمل نہیں"

"یہ کیسے جانا کہ تم نورمل نہیں۔

"میں سمجھتی ہوں کہ جو امی اور ابو نے کیا وہی کرنا چاہیئے تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اُن کی محبت کا پھل ہوں"

وہ صرف دس منٹ کے لئے آئی تھی، مگر نہ مجھے رخصت کرنے کا خیال آیا اور نہ اُسے جانے کا چند گھنٹے پہلے مجھے اُس کے وجود کا بھی یقین نہیں تھا۔ وہ میرے لئے ایک اجنبی تھی۔ کھانے کے بعد ہم بہت رات تک دو بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے میرین ڈرائیو کے کنارے ٹہلتے رہے۔ ایک مہکتا ہوا پھول تھا جو ہمارے درمیان کھلتا رہا پروان چڑھتا رہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کو برسوں سے جانتی ہوں" ہم دونوں ایک ہی بات محسوس کر رہے تھے۔

"کبھی زندگی کا ایک لمحہ صدیوں پر بھاری پڑ جاتا ہے"

"اور وہاں سے میرٹھ!" بوا کی یاد بہت ستانے لگی۔

"میرٹھ؟ نہیں تو — وہاں سے اپنے دوست کے ہاں ردولی گئے"

"ردولی؟ میاں کی سسرال؟ خوب!"

"کس کی سسرال؟" وہ چکرائی۔

"پھر؟ میں نے بات ٹالی۔

"ان کے دوست ابرار چچا وکیل تھے۔ طلاق لینے کی بہت کوشش کی"

"مرتے مرجاؤں گا مگر طلاق نہیں دوں گا" وہ کہا کرتے تھے۔

"جی ہاں اور ستم ظریفی تو دیکھئے، مرے بھی نہیں۔

کیا فرق پڑا؟ وہ زندہ ہی کب تھے۔؟"

"واقعی کوئی فرق نہیں پڑا"

جب طلاق کی کوئی صورت نظر آئی تو شبیر ماموں کے دوست نے رائے دی کہ اگر قدسیہ عیسائی ہو جائیں تو طلاق ہو سکتی ہے۔ کانپور کے ایک پادری سے رجوع کیا گیا۔ مگر جب اُسے تبدیلیِ مذہب کی وجہ بتائی تو بہت برافروختہ ہوا۔ نیز یہ کہ اگر پھر دوبارہ اسلام اختیار کیا تو طلاق باطل ہو جائے گی۔

مجھّو ماموں کو جب اس ہیر پھیر کی خبر ملی تو آ کر بہت دندمچایا۔ سب کو قتل کر کے قدسیہ کو لے بھاگنے کی دھمکیاں دیں۔ شبیر ماموں کی مرمت کرنے کی دھمکیاں دیں اُسی شام ایک قاضی کو لا کر نکاح کر دیا۔

"یہ نکاح نہیں ہوا" شبیر حسن کے دوست ابرار نے کہا۔ وہ وکیل تھے۔

"ہوا کیسے نہیں" وہ ابرار چچا کی گردن توڑنے پہ مصر تھے۔

اگر قدسیہ خالہ کے شوہر کو پتہ چل جاتا تو وہ دونوں کو حرام کاری کے جرم میں دھر لیتے۔

"امی کو اتنا دکھ کس بات کی سزا کے طور پر ملا؟" تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

"اور بوا کو بالے میاں سے کیوں جدا کردیا؟"

"کسی کے خواب چھین کر انھیں کچلنے میں کیا ملتا ہے؟"

"کیونکہ اس کی اپنی بانجھ دنیا میں خواب نہیں ہوتے۔

"اس لئے وہ دوسروں کا خون کرتا ہے؟ کیوں؟"

"احساسِ کمتری سے پیچھا چھڑانے کے لئے وہ چیخ چیخ کر کہتا ہے۔

میرا ملک عظیم ہے۔ میرا مذہب سب سے ارفع ہے۔ میرا شہر........ میرا گھر ......میری دنیا زیادہ بلند ہے، زیادہ مقدس ہے۔ میرا شعور، میرا یقین، میرا طریقۂ فکر صحیح ہے۔"

"مگر زبردستی"

"ہاں زبردستی۔ وہ خیال اور عمل کی آزادی کو ہر انسان کا حق سمجھتے ہیں، ڈیموکریسی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، تلوار کے زور سے ڈیموکریسی حلق میں ٹھونسنے لگتے ہیں۔ کبھی خدا کا حکم کہہ کر، کبھی کسی اصول یا جذبہ کی آڑ لے کر اور کبھی رسم و رواج کے بہانے اور کچھ نہ ملے تو بھوت پریت کے سر الجھام تھوپ دیتے ہیں۔"

صبح جب میں اسے ایرپورٹ پہ بدا کرنے گئی تو ہوائی جہاز میں داخل ہونے سے پہلے وہ بڑی دیر تک مجھ سے خاموش لپٹی کھڑی رہی۔ جیسے وہ کوئی پیغام میرے جسم میں چھوڑ جانا چاہتی ہے۔

"بس ایک دعا ہے۔" اس نے اناؤنسر کی آواز پر مڑتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" مسافروں کی قطار ہوائی جہاز کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

"کہ ہمیں بھی کوئی ایسی لگن سے چاہے جیسے ابو نے امی کو چاہا۔

اور..." اس نے تکلف سے آنکھیں نیچے گرا دیں۔

"اور ــــ؟ میں نے اُسے آخری پھاٹک کی سیڑھیوں پہ روک کر پوچھا۔ یہ چلی گئی تو میں یہ ادھوری بات کی خلش لئے رہ جاؤں گی۔

"جیسے مجھّو ماموں نے محبت نباہی"

"مجھّو چچا میاں؟ مستقیم چچا، وہ ٹیڑے میڑھے مستقیم! زمانے بھر کے رنڈی باز، خدائی خوار، شرابی لیچے، جو خاندان کی دمکتی ہوئی بلند پیشانی پر گھنا ؤنا پھوڑا تھے جنھیں کسی خاندانی لڑکی نے اپنا میلا آنچل تک نہ چھونے دیا۔ انھوں نے قدسیہ خالہ کو چاہا ـــ ایسے کہ آج قدسیہ کی بیٹی ان جیسے محبوب کا رومان دل میں بسائے ہوئے ہے"

مگر وہ جانتے تھے کہ ابو کے سوا ہی کسی اور کو گنتی میں نہیں لاتیں۔ ابو بیچارے تو پھنس پھنسے تھے!" وہ زور سے ہنسی۔ "ساری اسکیم مجھّو ماموں کی تھی۔"

وہ چلی گئی۔ ایکدم بڑا سخت تنہائی کا احساس چاروں طرف سے گھیرنے لگا۔

"مجھّو چچا!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "سنا تم نے؟ اس وقت تمہاری قبر میں جگنو جگمگا رہے ہوں گے۔"

انسان ایک دوسرے کو پہچاننے کا گُر کب سیکھیں گے؟

جہاز ایک بدمزاج دیو کی طرح لرزا گرجا اور آسمان کی بلندیوں کی طرف اُڑ گیا۔ " جاؤ رفیعہ حسن، تم بے دھڑک جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ زندگی کی قدروں کو ناپنے تولنے کے لئے تمہارا فیتہ ہے، اپنے باٹ ہیں ـــ اپنی ترازو ہے۔ تمہاری زندگی میں کوئی ڈنڈی نہ مار سکے گا ـــ تمہارے خواب کبھی چکنا چور نہ ہوں گے۔!

☀

کرشن چندر

ہانگ کانگ کی حسینہ

قیمت ۲/۵۰

## ...نگ کانگ کی حسینہ

مصنف: کرشن چندر

...نگ کی حسینہ" اردو کے عظیم اور مشہور و معروف ناول نگار
...جناب کرشن چندر نے اپنے اس نئے ناول میں ایک نئے اور اچھوتے
...اضافہ کیا ہے۔ مصنف نے اس ناول کے ذریعے جاسوسی ناول
...کو نئی راہ دکھلائی ہے، یہ ناول صرف عجیب و غریب اور حیرت
...ات کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ فرض اور محبت دونوں کو ایک ساتھ
...لے "انٹرپول" کے ایک ایسے ہونہار اور جانباز ایجنٹ کی انوکھی
...ہے، جس نے اپنی محبت کی خاطر اپنی جان عزیز قربان تو کر دی مگر
...کرنے والے ایک بین الاقوامی گروہ کا پردہ فاش کر دیا۔ اور
...کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ و جاوید کر دیا۔ طرز تحریر اس قدر پیارا
...ہے کہ آپ داد دیئے بغیر نہیں رہیں گے۔ پڑھیے اور مصنف
...یجیے۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

## میلی چاندنی

مصنف: گلشن نندہ

"میلی چاندنی" اردو کے عظیم اور مقبول عام ناول نگار گلشن نندہ کی تازہ ترین تخلیق ہے "میلی چاندنی" پیار اور پیسے کے پس منظر میں دو حسین و جمیل دوشیزاؤں اور ایک نوجوان کی انوکھی تکون کہانی ہے۔ واقعات سبق آموز نظارے حسین اور دلکش جذبات کے چیختے چنگھاڑتے طوفان میں چٹکی چاندنی، جو جتنی میلی تھی اس سے کہیں زیادہ اجلی ثابت ہوئی، مصنف نے کہانی کو اسقدر جذبات میں ڈوب کر لکھا ہے کہ پڑھنے والا پڑھتے پڑھتے خود بھی جذبات کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔

پڑھیئے اور اندازہ لگایئے کہ ہم نے کہاں تک اس ناول کے بارے میں درست کہا ہے۔ گلشن نندہ نئی نسل کا مقبول ترین ناول نگار ہے اور اس نے "میلی چاندنی" کو اپنی سب سے بہترین تخلیق قرار دیا ہے۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

اردو پاکٹ بکس (پاکستان) ناظم آباد ۲ کراچی ۱۸